طلوعِ اسلام

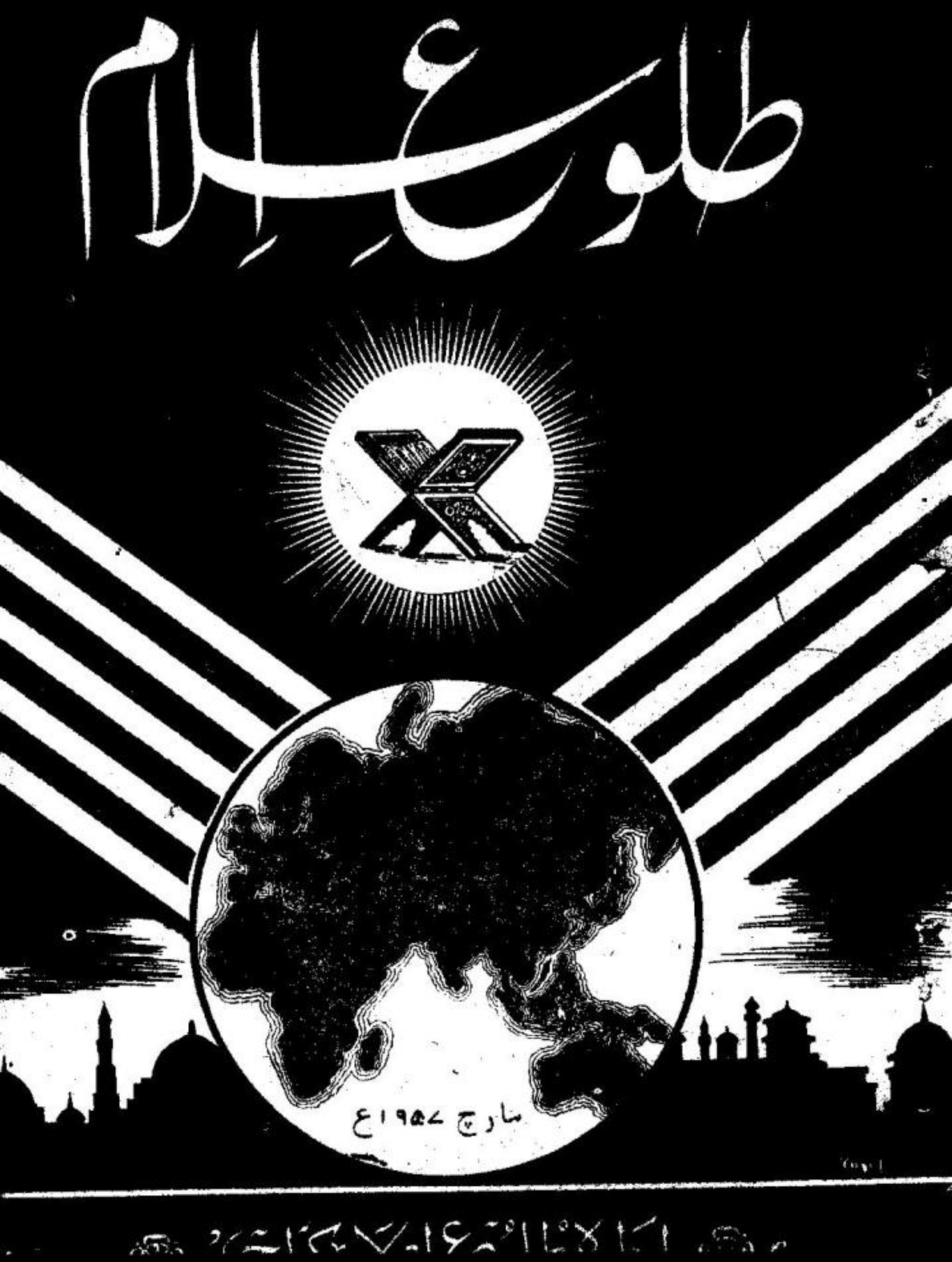

مارچ ۱۹۵۷ء

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ: ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر: ۴۱۴۸۸
خط و کتابت کا پتہ: ۳/۱۵۹۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی
ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۲۹

جلد ۱۰ | مارچ سنہ ۱۹۵۷ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات		۲ — ۸
مقامِ محمدی	(محترم پرویز صاحب)	۹ — ۳۲
معراجِ نبویؐ	(محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)	۳۳ — ۳۷
رابطۂ باہمی	(سکریٹری مرکزی بزم طلوعِ اسلام)	۳۸ —
قرآنی معاشرہ	(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)	۴۱ — ۴۸
مجلسِ اقبال		۴۹ — ۵۷
حقائق و عبر		۵۸ — ۶۲
نقد و نظر		۶۳ — ۷۴
اشتہارات		

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کے حصول و قیام سے مقصد یہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں بسنے والی امتِ مسلمہ اپنے تصورات حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے مملکتِ پاکستان کا آئین ایسا ہونا چاہیئے تھا جو ان تصورات حیات کا آئینہ دار ہو۔ (جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں) ہماری مجلس آئین ساز نے جو دستور سال گذشتہ منظور کیا (اور جو سردست آئینِ پاکستان کہلاتا ہے) وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہمارا آئین ہمارے تصورات حیات کا مظہر نہ ہو، وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔

آئین سے نیچے اتر کر مملکت کے قوانین کا سوال سامنے آتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی معاشرہ میں نظم و توازن پیدا کرنے اور قائم رکھنے کے لئے قوانین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آئینِ پاکستان میں ایک شق یہ بھی ہے کہ صدرِ مملکت ایک کمیشن متعین کرے گا جو ملک کے قوانین کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے گا جن کی روشنی میں مجلس قانون ساز ملک کے قوانین وضع کرے گی۔ اس میں شک نہیں کہ جس شق میں اس کمیشن کے تقرر کا ذکر ہے۔ اس کا مقصد و غیر تسلی بخش، منطوق مبہم اور زبان ناقص ہے۔ لیکن چونکہ اس کمیشن کو بہر حال متعین ہونا اور قانون سازی کے سلسلہ میں اپنی سفارشات پیش کرنا ہے اسلئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں یہ واضح کر دیں کہ قرآن کی رُو سے ایک اسلامی مملکت میں قانون سازی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اس کے حدود و قیود کیا؟ اگر کمیشن کے ارکان نے ہماری ان گذارشات کو درخور اعتنا سمجھا تو ہمیں یقین ہے کہ یہ ان کے اس نہایت اہم، مشکل اور نازک ترین فریضہ کی سرانجام دہی میں ممد و معاون ثابت ہوں گی (یہ حقیقت قارئین سے پوشیدہ نہیں کہ ہمارا مسلک ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو کچھ موجود ہے اسمیں اصلاح کی جائے اور اسے صحیح اسلامی نصب العین تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔ ہماری زیر نظر گذارشات کا محرک بھی یہی جذبہ ہے)

یہ ظاہر ہے کہ ہر تقنین (قانون سازی) کی ایک بنیاد ہوتی ہے، جب تک اس بنیاد کو نہ سمجھا جائے، متعلقہ قوانین کے سانچے تیار کرنے میں ایک قدم بھی صحیح سمت کی طرف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی قوانین کی بنیاد کیا ہے

اس سوال کے جواب کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام نے خود زندگی اور اسکی حقیقت کے متعلق کیا اصول بیان کیا ہے۔ یہی اصول اسلامی تقنین کی بنیاد ہوگا۔

قدیم یونانی فلسفہ نے بتایا کہ کائنات ایک جامد اور مکمل شکل میں موجود ہے۔ نہ اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے نہ حک و اضافہ دوسری طرف مغرب کے نظریۂ مادیت (Materialism) نے یہ کہا کہ زندگی مادہ کی پیدا کردہ ہے اور چونکہ مادہ میں ہر آن تغیر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے کائنات میں کوئی ایسی شے نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔

ان دونوں نظریات کے برعکس قرآن نے یہ بتایا کہ زندگی ثبات Permanence اور تغیر (Change) کے امتزاج سے عبارت ہے۔ اس کا سرچشمہ اولیں، مادہ سے ماورا، لہٰذا تغیرات سے غیر متاثر ہے۔ لیکن اسکی نمود (Appearance) مادی پیکروں میں ہوتی ہے جن میں ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسلئے ثبات اور تغیر دونوں اسکے تقاضے ہیں۔ ثبات سے مراد وہ مستقل اقدار ہیں جو زمان و مکان (Time and Space) کی حدود سے ماورا ہیں۔ اور تغیر سے مفہوم وہ محسوس قالب ہیں جن میں ان مستقل اقدار کا ظہور (Manifestation) ہوتا ہے اور جو حالات کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا وہ اصول جسے قرآن نے پیش کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہی قوانین اسلامی کہلا سکتے ہیں جو ثبات اور تغیر دونوں کے امتزاج سے ترکیب پائیں۔ اس مقصد کے لئے ثبات سے مراد ہوں گے وہ غیر متبدل اصول جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اور جو زمان و مکان کے تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ اور تغیر سے مقصود ہیں وہ جزئی قوانین جو ان غیر متبدل اصولوں کے حدود کے اندر رہتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کئے جائیں۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ یہ ہے اسلامی قانون سازی کا بنیادی اصول۔ اگر یہ اصول نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو وضع قوانین کے سلسلہ میں ایک قدم بھی صحیح سمت کی طرف نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اصطلاحی زبان میں اس اصولِ قانون سازی کا نام اجتہاد ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں کوشش کرنا۔ جدوجہد کرنا یہی وہ طریق ہے جسکی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے (یعنی ہماری بابت) پوری پوری جدوجہد سے کام لیں گے۔ ہم ان کی راہ نمائی اپنے راستوں کی طرف کر دیں گے۔ یقیناً اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حسن کارانہ انداز سے معاملات کا توازن و تناسب قائم رکھتے ہیں۔ ثبات و تغیر میں توازن و تناسب قائم رکھنے کا یہی وہ حسن کارانہ انداز تھا جس سے قرنِ اول میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین میں تبدیلیاں اور اضافے ہوتے چلے گئے۔ اور تطبیق بہ احوال و ظروف Adaptability to Environment) کا یہی وہ اصول تھا جسکی بنا پر یہ قوانین اس زمانے میں بھی نہایت حسن و خوبی سے نافذ العمل رہے۔ جب اسلامی مملکت کے حدود ایک چھوٹی سی بستی سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ اور اس دور میں بھی جب (عہد حضرت عمرؓ میں) اس کا رقبہ قریب بائیس لاکھ مربع میل تھا اور مختلف تمدن و معاشرت کی حامل قومیں اسکے دائرہ میں آگئی تھیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد اجتہاد کا یہی حیات آفریں اصول ہمارے دورِ ملوکیت میں بھی (کم و بیش) قائم رہا۔ اس دور میں اگرچہ سیاست آہستہ آہستہ دین سے جدا ہوتی جا رہی تھی، لیکن قانون سازی میں اجتہاد و تفقہ کا اصول معطل نہیں ہوا تھا۔ زوالِ بغداد کے بعد جب ملت کی سیاسی مرکزیت بھی تباہ ہو گئی تو ان کے ہر شعبۂ زندگی پر جمود چھا گیا۔ اس سے اجتہاد کا دروازہ اس طرح بند ہوا کہ پھر آج تک کھلنے ہی نہ پایا۔ چنانچہ اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو قوانین آج سے سینکڑوں سال پہلے (اُس زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر) وضع ہوئے تھے، ان میں ذرا سا تغیر و تبدل بھی جائز نہیں سمجھا جاتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دنیا آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہم اُس چینی لڑکی کی طرح جس کے پاؤں میں لوہے کے جوتے پہنا دیئے گئے ہوں، اپنے مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

یہاں تک اُس جمود کا ذکر تھا جو اہلِ فقہ کے ہاں پایا جاتا ہے (انھیں عرفِ عام میں مقلد کہا جاتا ہے)۔ ہمارے ہاں دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے آپ کو حدیث کا پیرو کہتا ہے۔ (انھیں عام طور پر غیر مقلد کہا جاتا ہے)۔ اس طبقہ کا جمود، اول الذکر طبقہ سے بھی زیادہ سخت اور ان کا معاملہ اُن سے کہیں زیادہ مشکل اور نازک ہے۔ ان کے جمود کا عالم یہ ہے کہ جو کچھ ہماری کتبِ روایات میں مذکور ہے یا اُس سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہونے کو بھی سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ باقی رہا ان کے معاملہ کا مشکل اور نازک ہونا، سو اسے یوں سمجھئے کہ جب ہم فقہ کے کسی مسئلہ میں تبدیلی کا ارادہ کریں گے تو اسکے خلاف یہ کہا جائے گا کہ یہ فلاں امام کے مسلک (یا فیصلہ) کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن اگر کسی ایسے مسئلہ میں تبدیلی کا خیال کیا جائے جو کسی حدیث میں مذکور ہے تو اسکے متعلق شور بپا ہو جائے گا کہ یہ سنتِ رسول اللہؐ سے انکار اور اطاعتِ رسولؐ سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ کسی امام کے فیصلہ سے اختلاف اور رسول اللہؐ کی سنت سے (مزعومہ) انحراف میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ایک اسلامی مملکت کی قانون سازی کے معاملہ میں دشواری کا سامنا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ ہماری کتبِ روایات میں جو کچھ مذکور ہے کیا ایک اسلامی مملکت اس میں کوئی تغیر و تبدل کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کی دہرانے کی نہ یہاں ضرورت ہے، نہ گنجائش۔ ہم اس مقام پر علامہ اقبال کا ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس باب میں امام ابو حنیفہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا مسلک کیا تھا۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علی حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علی حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انھیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی

ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اسکے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کرے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انھیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے۔ اور انھیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور تمہید استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اسکے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انھیں آنیوالی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اسلئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحب اسکی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطبات اقبال صفحہ ۱۶۴-۱۶۳)

آپنے ملاحظہ فرمالیا کہ اس اہم سوال کے متعلق دنیائے اسلام کے تین عظیم مفکرین اور مقننین کا کیا خیال ہے؟ عالم اسلام میں امام ابوحنیفہؒ کی قانونی حیثیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہؒ آتے ہیں جن کا علمی مقام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آخر میں علامہ اقبالؒ ہیں جن

کے متعلق کم ازکم اتنا تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو مملکتِ پاکستان کے لئے دستور و قوانین مرتب کرنے کا اہم فریضہ انہی کی تحویل میں دیا جاتا اور جو کچھ وہ مرتب کر کے دیتے اُسے دنیا کے سامنے فخر و مسرت سے پیش کیا جا سکتا۔ حدیث کی حیثیت کے متعلق اِن ائمۂ قانون و فکر کی یہ رائے اُن حضرات کے لئے یقیناً راستہ کی ایک بہت بڑی مشکل کے حل کر دینے میں معاون ہو گی جن پر اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا فریضہ عائد ہوتا ہو۔

ہمیں اس تلخ حقیقت کا کلی احساس ہے (اور عملی تجربہ) کہ ہمارے مروجہ قوانینِ شریعت میں (خواہ وہ فقہ پر مشتمل ہوں یا احادیث پر) کسی تبدیلی کی تجویز یا کوشش ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے سخت مخالفت کا موجب بن جاتی ہے۔ خود علامہ اقبال کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ فقہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائیگا۔ اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔ بایں ہمہ میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت ضرور کروں گا۔　　(خطبات صہ ۱۵۶)

علامہ اقبال نے یہ بات اُس زمانے (۱۹۲۸ء) میں کہی تھی جب یہاں انگریزوں کی حکومت قائم تھی، اور ہمارے لئے اپنے تصورات کے مطابق قانون سازی کا سوال محض نظری حیثیت رکھتا تھا لیکن اب اس نے یکسر عملی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب ہماری اپنی مملکت ہے جس نے قانون سازی کے مسئلہ کے عملی حل کے لئے ایک کمیشن کا تقرر کر لیا ہے۔ اس کمیشن کے سامنے سب سے پہلے یہی سوال آئے گا کہ جو کچھ ہمارے ہاں اس وقت قانون شریعت کے نام سے متعارف و مروج ہے کیا ہمیں اُسی کو من و عن اختیار کر لینا ہے۔ یا اس میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل بھی کیا جا سکتا ہے؟ اگر اس کمیشن نے جرأت و بصیرت سے کام لیا اور ثبات و تغیر کے اُس اصول کے مطابق قانون سازی کے مسئلہ کو سلجھایا جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے تو یہ حضرات ایسی عظیم القدر خدمت سرانجام دینگے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملیگی اور جو ہماری آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ ہدایت اور دلیلِ راہ ہو گی۔ علامہ اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورِس پروڈنس (Jurisprudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی ہو گا۔ ...... افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں ...... میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخِ اسلام میں

ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (اقبالنامہ۔ جلد اول صفحہ ۵۱-۵۰)

جب اقبال نے یہ لکھا تھا اُس سے کہیں زیادہ شدت سے آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ۔

تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

جب ایک اسلامی مملکت نے قانون سازی کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا ہو۔ جو دنیا کو بتائے کہ قرآن کے اصول کس طرح ایسا ضابطہ قوانین عطا کرتے ہیں جن کی اتباع میں نوعِ انسانی کی نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔

کیا مجوزہ کمیشن کے ارکان ہماری ان مخلص گذارشات کو درخورِ اعتنا سمجھیں گے؟

دستورِ پاکستان میں ایک شق یہ بھی ہے کہ حکومت کی طرف سے اسلامی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ تاکہ معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پر تشکیل کیا جا سکے۔ ہمارے نزدیک اس ادارے کا قیام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چونکہ مملکتِ پاکستان کے وجود (Existence) کا جواز (Justification) ہی یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی تصورات کے مطابق تشکیل ہو سکے۔ اسلئے اس مقصد کے لئے ایک تحقیقاتی ادارہ (ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کا قیام بنیادی ضرورت میں سے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تحقیقاتی ادارہ میں ریسرچ کس قسم کی ہوگی؟ ظاہر ہے کہ اگر اسکی تحقیقات کی نوعیت اس قسم کی ہوئی کہ عمر خیام کی رباعیات کے نسخے دنیا کی کس کس لائبریری میں ہیں اور کلیلہ دمنہ کا اصل مصنف کون تھا؟ تو اس سے مقصد پیشِ نظر حاصل نہیں ہوگا (ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ قوموں کی زندگی میں ادب کا بھی ایک مقام ہے لیکن جس مقصد کے لئے زیرِ نظر تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جائے گا۔ وہ اس سے یکسر مختلف ہے) یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا مروجہ اسلام وہ نہیں جسے نبی اکرمؐ نے خدا سے پاکر دنیا کو دیا تھا۔ قرآن بیشک اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ لیکن جس قسم کا نظام اور معاشرہ قرآن کا مطلوب و مقصود ہے اسکی کوئی جھلک بھی ہمارے معاشرے میں نظر نہیں آتی۔ لہٰذا اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا اولین اور بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ گہری تحقیقات کے بعد متعین کرے کہ ہمارے مروجہ اسلام میں کون کون سے عناصر غیر قرآنی ہیں وہ کس کس جگہ سے آکر اسلام کا جزو بن گئے ہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے بھی اشارہ کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے کہ سر سکندر حیات خاں مرحوم نے ایک ضمنی سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ عقیدتمندانِ اقبال کو چاہیئے کہ وہ حضرت علامہ کی خدمت میں روپوں کی تھیلی (Purse) پیش کریں۔ اس تجویز کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ

> میرا خیال ہے کہ ایک فرد کی ضروریات کے مقابلہ میں قوم کی ضروریات زیادہ شدید اور اہم ہوتی ہیں خواہ اس فرد کا پیام اس کی قوم کے لئے کتنا ہی بڑا سرچشمۂ فکر و عمل کیوں نہ ہو۔ فرد اور اس کی ضروریات آنی جانی ہیں۔ لیکن قوم اور اس کی ضروریات باقی رہتی ہیں (میرے نزدیک) اسلامیہ کالج میں دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ایک اسلامی تحقیقاتی شعبہ (Chair) کا قیام قوم کی شدید ترین ضروریات میں سے

ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تاریخ۔ ادبیات۔ فقہ اور تصوف کی حقیقت سے بے خبری سے اس قدر ناجائز فائدہ اور کہیں نہیں اٹھایا گیا جس قدر پنجاب میں اٹھایا گیا ہے۔

وقت کا شدید تقاضا ہے کہ اسلامی فکر و عقائد کی بنیادی تحقیق سے لوگوں کو بتایا جائے کہ اسلام کا مقصود و منتہیٰ کیا تھا اور ہندی مسلمانوں کے ضمیر پر غیر اسلامی تصورات کی جو پپڑی جم گئی ہے۔ اسکے نیچے اسلام کے صحیح اصول و مبادی کس طرح ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس غیر اسلامی پپڑی (Crust) کو جلد از جلد الگ کر دیا جائے۔ تاکہ ملت کے نوجوان طبقہ کی ضمیر آزادانہ طور پر ابھر سکے۔

(اقبال کے بیانات اور تقاریر)

یہ ہے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ) کا اولین مقصد اور فریضہ۔ یعنی وہ ہمارے مروجہ نظریات و تصوراتِ حیات کو ایک ایک کر کے لے اور انہیں قرآن کی روشنی میں پرکھ کر ان سے تمام غیر قرآنی آمیزشوں کو الگ کرتا جائے۔ تاکہ اس طرح ایکبار پھر وہی اسلام ہمارے سامنے آجائے جس نے قرنِ اول میں ملتِ اسلامیہ کو نوعِ انسانی کی امامت کا سزاوار بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی اہم، مشکل اور نازک ہے۔ لیکن ناممکن نہیں۔ اگر اس ادارہ کو صحیح خطوط پر متشکل کیا جائے۔ اور اس میں کام کرنے والے بیرنگی اور اک سے (Un-biased) تحقیق کے کام میں لگ جائیں۔ تو غیر اسلامی عناصر کو حقیقی اسلام سے متمیز کر کے دکھا دینا ناممکن نہیں ہوگا۔

چونکہ مجوزہ قانونی کمیشن Law Commission کو اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں بھی ایک تحقیقاتی ادارہ کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ (بہتر ہوگا کہ) مذکورہ صدر تحقیقاتی ادارہ کو سردست اسی کمیشن کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ جب کمیشن اپنا کام ختم کر لے تو اس کے بعد یہ ادارہ آزادانہ کام کرنے لگ جائے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ (لا کمیشن کی طرح) یہ ادارہ بھی حکومت کے کسی محکمہ (ڈیپارٹمنٹ) کے ماتحت نہ رکھا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ڈر ہے کہ خود وہ محکمہ اس کے آزادانہ نشوونما کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائے گا۔ نیز کمیشن اور تحقیقاتی ادارہ کو ملک کی فرقہ وارانہ سیاست (Party Politics) کے سایہ سے بھی دور رکھا جائے تاکہ پارٹیاں آئیں اور پارٹیاں جائیں۔ لیکن یہ اہم ادارے اطمینان سے اپنا کام کرتے جائیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی دس سالہ زندگی میں لا کمیشن اور تحقیقاتی ادارہ کا قیام سب سے پہلا تعمیری قدم ہے۔ اگر ان کی تشکیل صحیح خطوط پر ہو گئی تو ان سے بیش قیمت مثبت نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر انہیں پارٹی پالیٹکس کی نگاہ فریب کمین گاہ یا مذہبی فرقہ داری کا مقدس دخمہ بنا دیا گیا تو سوائے اسکے کہ ہمارے دیگر اسلامی شعائر و رسوم کی طرح یہ بھی ملت کی زندہ آرزوؤں کا سرداب بن کر رہ جائیں اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وذلک ھو الخسران المبین۔

طلوع اسلام کے پرانے پرچے | بابت ۱۹۵۶ء دو تہائی قیمت پر مل سکتے ہیں۔ اور اس سے پہلے کے پرچے نصف قیمت پر ضرورت مند حضرات جلد طلب کریں۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (۵۳/۷)

علم و شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ

مقامِ محمدیؐ

گردِ او گردد حریمِ کائنات

تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا

ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج!

محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے طلوع اسلام کنونشن میں کی۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

مقامِ محمدیؐ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

برادرانِ عزیز!

آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا مشن پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے۔ لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ مقامِ محمدیؐ نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ مقامِ محمدیؐ (کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقامِ نبوت کہا جائے گا) ماورائے سرحدِ ادراک ہے۔ یعنی وحی کا سرچشمہ وہ مقام ہے جو انسانی عقل سے آگے ہے۔ اس لئے نہ تو مقامِ محمدیؐ کا تعین عقل کی رو سے کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی عقل کی رُو سے اس کی کنہ، حقیقت اور کیفیت و ماہیت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی ہے اور وہ نبی کو کس طرح ملتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جاسکتا ہے اسے خدا ہی سمجھا سکتا ہے جو وحی کا سرچشمہ ہے۔ اس مقام کے متعلق یوں تو قرآن کے مختلف گوشوں میں منتشر طور پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات میں اسے اس حسنِ ایجاز و اختصار سے بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے ان چھوٹے چھوٹے موتیوں میں بڑے بڑے اہم حقائق اس طرح سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ ان آیات کے متعلق میں نے اس سے پہلے (سلیم کے نام ایک خط میں) بھی لکھا تھا لیکن آج کی نشست میں انھیں ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا تاکہ قرآن کی روشنی میں مقامِ محمدیؐ ابھر کر سامنے آجائے۔

ان آیات تک پہنچنے سے پہلے، تمہیداً کچھ عرض کرنا ضروری ہے یہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی تھی کہ ہمارے دور میں جس قوم (اہلِ مغرب) نے سائنس کی دنیا (کائناتی علوم) میں اس قدر تحقیق و تفتیش کی اُس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا اور جن حقائقِ کائنات کو وہ وحی کی بنا پر پیش کرتا تھا وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے کہ جو وحی حضرت عیسےٰ کی طرف نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اور

جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ درحقیقت انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی نتیجہ اس کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفسِ وحی ہی سے بدگمان ہوگئے. چنانچہ وہاں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہی ہے لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے ان سے خدا اور اس کی راہ نمائی کا کوئی واسطہ نہیں. انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہئیں. انسانی راہ نمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں. یہ تحریک (Humanism) کے نام سے متعارف ہے.

Humanism

اس تحریک کے علمبردار اسے محض ایک فکری تحریک تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے. ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے. چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (Julian Huxley) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (Religion Without Revelation) یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں ہے. اس وقت اس کی فرصت نہیں (اور یوں بھی اس سے میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا) ورنہ میں بتاتا کہ ہکسلے جس قسم کے مذہب کی تلاش میں ہے وہ کس طرح قرآن کی وحی میں پہلے ہی سے موجود ہے. نہ صرف اُتنا جتنے کی اسے تلاش ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ. اگر مغرب کے ان مفکرین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی کہ خدا کی وحی جو اپنی اصلی شکل میں ہو وہ نہ علم کی دشمن ہوتی ہے نہ عقل کی حریف. اور اس کے پیش کردہ حقائق علمی تحقیقات کی روشنی میں مسلمات بن کر اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں. بہرحال ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اُس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں لیکن اُس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں. اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (Psychological Contradiction) ہے جس کی رو سے وہ ایک طرف اُس تسکین کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پابندیوں سے بھی آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں.

قرآن کا جواب

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآن نے ان (Humanists) کو للکار کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے؟ محض کائناتی خدا کو ماننا اور انسانی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا، خدا پر ایمان نہیں. اس سے انکار ہے. لہٰذا اگر تم نے اسے ماننا ہے تو پورے طور پر مانو اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸) اور اگر انکار کرنا ہے تو کھلے بندوں انکار کرو. یہ کیا کہ

منکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

آپ شاید کہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں (Humanist) کہاں تھے جو اس نے انہیں للکار کر ان کی اس غلط روش پر متنبہ کیا. یہ تو ہمارے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں. یہ ٹھیک ہے کہ اُس زمانے میں (Humanists

نام کمانے والا طبقہ نہیں تھا۔ لیکن قرآن کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی ہر لغزش کو نمایاں (Point Out) کرتا اور اس کی خامیوں کو واضح کر کے مثبت دلائل سے اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس نے (Humanists) کی غلط نگہی کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورۂ المومنون میں ہے قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے؟ اور اس کا مالک و آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب تعصب اور جہالت سے نہ دیں۔ علم و بصیرت کی رو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ یقیناً یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ اس کے لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ قرآن اس پر کہتا ہے کہ جب تمہاری عقل و دانش اور علم و بصیرت تمہیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے، تو پھر تم اصل حقیقت کو کیوں اپنے سامنے نہیں لاتے۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس فضائے آسمانی میں تیرنے والے مختلف کروں میں جو کچھ ہے ان کی زندگی اور نشوونما کس قانون کے مطابق ہو رہی ہے؟ نہیں! اتنا ہی نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشوونما (Development) کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳/۸۶) اس کے جواب میں بھی یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول بھی خدا ہی کے لئے ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ (قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے پر اقتدار کس کا ہے۔ کس کا قانون ہے جس کے تابع یہ تمام اشیاء اس طرح مصروفِ سعی و عمل ہیں۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈھتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم و بصیرت اس کا کیا جواب دیتا ہے قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲۳/۸۹) وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)

خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی ان کارفرمائیوں کا اقرار لینے کے بعد قرآن یہ پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں خود اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے کہ

(۱) خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل، مستقل، محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں۔ اور

(۲) یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں۔

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدل قوانینِ حیات، مستقل اقدار Permanent Values

کی ضرورت ہے۔ اور یہ مستقل اقدار اس کی اپنی عقل و خرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ کون سی بات ہے جس سے تمہیں اس کا دھوکا لگتا ہے کہ انسان کائنات کے اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے (فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ ۲۳/۸۹) کیا انسان بھی اسی کائنات کا ایک حصہ نہیں؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو صرف اس بات میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیبِ خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے۔ اور دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں۔ بَلْ اَتَیْنٰھُمْ بِالْحَقِّ ہم ہی انھیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹے ہیں۔ وَ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ۲۳/۹۰

آپ نے غور کیا کہ قرآن کس طرح (Humanists!) کے اس مسلک کی تردید کرتا ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کو تسلیم کر لیا جائے۔

خدا پر ایمان کے معنی

لیکن انسانی دنیا میں اس کی طرف سے راہ نمائی کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ وہ اسے خدا پر ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ قوانین کی ضرورت سمجھی جائے۔ اور اس کی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین (Humanism) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کر کے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے

اہل مغرب کا اعتراف

چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی (Physicist) ایڈنگٹن اپنی کتاب Science And The Unseen World میں لکھتا ہے کہ

> اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے[1]

اوسپنسکی (Ouspensky) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ

> اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے: جو فکر انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے۔ انھیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے

---

[1] یہ الگ سوال ہے کہ ایڈنگٹن کے ذہن میں وحی کا تصور کس قسم کا ہے

تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔

(New Model Of The Universe)

آپ نے غور کیا کہ خود مغرب کے مفکرین کس طرح، خدا کے ساتھ وحی کی ضرورت کو لاینفک قرار دے رہے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک، مقام نبوت کے بغیر مذہب کا تصور ہی ممکن نہیں۔

اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے مقام نبوت کو کن الفاظ میں سمجھایا ہے۔ لیکن یہاں پھر چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں

کتاب کیسی ہو؟

اسی ہکسلے نے اگست ۱۹۵۲ء میں نیویارک میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ جس مذہب کی تلاش میں وہ ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے

جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہوسکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ (نیویارک ٹائمز ۲۲ ۸/۵۲)

دیکھئے کہ قرآن کریم اس معیار پر بھی کس طرح پورا اترتا ہے۔ اس نے بات یہ سمجھائی ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے ایک غیر متبدل قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور وہ قانون اس کا اپنا وضع کردہ نہیں، اسی طرح انسان کے لئے بھی اسی قسم کے غیر متبدل قوانین کی ضرورت ہے۔ جو اسے وحی کی رو سے ملیں۔ قرآن نے یہ بات سمجھائی تھی اور (سب سے پہلے) سمجھائی تھی اُس قوم کو جو نہ کارگہ کائنات کے نظم و نسق سے واقف تھی نہ سائنٹیفک تحقیقات سے آشنا

قرآن کی اوّلیں مخاطب قوم

اُس قوم کی علمی سطح کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ قوم آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے دورِ حاضرہ والے تاریک زمانہ (Dark Ages) کہتے ہیں۔ یعنی خود زمانے کے اعتبار سے وہ دور تاریکی کا دور تھا۔ پھر اس تاریکی کے دور میں عرب کا ملک، اپنے ہم عصر ممالک میں، تہذیب و تمدن تو ایک طرف علم و بصیرت میں بھی سب سے پیچھے تھا۔ اس خطہ میں ایسے لوگ بھی بہت کم تھے جو معمولی نوشت و خواند ہی سے واقف ہوں۔ یہ لوگ اونٹوں کے دودھ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرتے تھے۔ یہ تھے اوّلیں مخاطب جنھیں یہ سمجھانا تھا کہ تمہیں زندگی میں مستقل قوانین کی ضرورت ہے اور یہ قوانین وہاں سے ملیں گے جہاں سے خارجی کائنات کو قوانین فطرت ملے ہیں۔ دیکھئے کہ قرآن اس بلند اور دقیق حقیقت کو ان لوگوں کو کن الفاظ میں سمجھاتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس حقیقت کو جن الفاظ میں اس جاہل اور ناخواندہ قوم کو ازمنہ مظلمہ میں سمجھایا گیا تھا وہی الفاظ آج اس دورِ علم و تمدن میں بلند ترین مفکروں کے سامنے کس طرح انکشافِ حقیقت کرتے ہیں؟

وہ بادیہ نشین قوم تھی۔ زندگی کا معمول یہ کہ — ہر صبح سفر، ہر شام سفر، بلکہ صبح تو گئے ہے مابہے۔ سفر اکثر و بیشتر شام ہی کو ہوتا۔ اس لئے کہ دن کے وقت ریگستان میں سخت گرمی ہوتی۔ اور ان کے کارواں اکثر راتوں کو سفر کرتے۔ لیکن ان کا یہ سفر گرانڈ ٹرنک روڈ پر نہیں ہوتا تھا کہ پشاور سے چلئے اور آنکھیں بند کئے سیدھے کلکتہ پہنچ جایئے۔ ان کا سفر صحراؤں میں ہوتا جن میں نہ کہیں سڑکیں تھیں نہ نشاناتِ راہ۔ اگر کبھی کسی نے کوئی نشانات متعین بھی کرلئے۔ (مثلاً یہ کہ یہاں کوئی ٹیلہ ہے اور وہاں کچھ جھاڑیاں) تو صحرا میں چلنے والی ہوائیں اور ان سے اڑنے والی ریت دوسری شام تک ان نشانات کو بدل کر رکھ دیتی۔ جہاں کل ٹیلہ تھا وہاں آج گڑھا ہے۔ جہاں گڑھا تھا۔ وہاں ریت کا ڈھیر ہے۔ پھر وہاں بستیاں اور آبادیاں بھی قریب قریب نہ تھیں کہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھ لیا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ ان حالات میں سفر کرتے تھے اور وہ بھی تاریک راتوں میں۔

ستاروں کی راہ نمائی

ان سے کہا گیا کہ تم جو ان صحراؤں میں، اندھیری راتوں میں سفر کرتے ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرو۔ یا راستہ پالینے کے بعد پھر بھٹک جاؤ۔ تو ایسا کس طرح سے ہوتا ہے؟ وہ کون سے مستقل نشانات ہیں جن سے تم راہ نمائی حاصل کرتے ہو؟ ان کا جواب صاف اور سیدھا تھا کہ ہم تاریک راتوں میں ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسے سچے راہبر ہیں کہ راستہ دکھلانے میں نہ کبھی غلطی کرتے ہیں نہ دھوکا دیتے ہیں۔ قرنہا قرن سے ہمارا یہ تجربہ ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی شہادت ملتی چلی آرہی ہے۔ ان کی راہ نمائی پر نہ زمانے کا اختلاف اثر انداز ہوتا ہے نہ ملکوں کا بُعد اور تفاوت۔ یہ ہر زمانے اور ہر قوم کو یکساں راہ نمائی دیتے ہیں۔ ان کا شروع سے یہی انداز چلا آرہا ہے۔ اور آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

اس پر ان سے کہا گیا کہ ذرا سوچو کہ جس خدا کی طرف سے ستاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی میں نہ غلطی کرتے اور نہ دھوکا دیتے ہیں۔ اگر اسی خدا کی طرف سے تمہیں بھی راہ نمائی ملے تو کیا وہ راہ نمائی بھی ستاروں کی راہ نمائی کی طرح مستقل، غیر متبدل، قابلِ اعتماد، سہو و خطا سے مبرّا اور فریب دہی کے امکان سے بلند و بالا ہوگی یا نہیں!

والنجم اذا ھویٰ

یہ ہے وہ مقام جہاں سے سورۂ والنجم کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی (۵۳/۱) طلوع ہونے والا ستارہ۔ جب وہ اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (۵۳/۲) تمہارا یہ رفیقِ سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا جانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ اس لئے کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (۵۳/۳) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنے تخیلات و تصورات سے نہیں کہتا۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۴) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔ انسانی

انسانی خیالات کی کیفیت

خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

جو باتیں ہم بچپن میں کرتے ہیں، ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے تو ان پر خود ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ جوانی کے جن فیصلوں کو ہم عقل و تدبیر اور دانش و بینش کا کمال سمجھتے ہیں، پانچ سات برس بعد، وہ چند نادانیوں سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتے اس کے بعد علم و تجربہ میں کچھ پختگی آنے لگتی ہے تو بڑھاپا آجاتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت تو عمر کی مختلف منزلوں میں ہوتی ہے۔ ایک ہی منزل میں حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے عالم میں خیالات اور کس قسم کے ہوتے ہیں، بیماری کے زمانے میں اور قسم کے۔ حالات مساعد ہوں تو زاویۂ نگاہ اور قسم کا ہوتا ہے اور جب پریشانیاں گھیر لیں تو تمام نظریات و تصورات بدل جاتے ہیں۔ غصے کے عالم میں ہمارے خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں اور سکون کی حالت میں اور قسم کے۔ یہ حالت تو افراد کی ہے۔ اگر قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جن باتوں کو کوئی قوم سو سال پہلے علم و دانش کی معراج سمجھتی تھی آج وہ خود ان پر ہنستی ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے خیالات سے کوئی بات کہے گا وہ اس کی طبعی کیفیات اور ذہنی اور قلبی میلانات سے متاثر اور اُس کے زمانے کے احوال و ظروف سے متاثر ہوگی، اس لئے وہ کبھی مستقل اقدار (نہ بدلنے والے قوانین) کا تعین نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز صرف اُس سرچشمہ سے مل سکے گی جو زمان و مکان کے ہر قسم کے اثرات سے مبرّیٰ ہو۔ اور قلبی و ذہنی عواطف و میلانات کی رنگینی سے معرا۔ اسے وحی کہتے ہیں۔

وحی کی خصوصیت

انہی حقائق کو قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق سورہ انعام میں ہے وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (۶/۹۷) اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے ستاروں کو اس انداز سے بنایا کہ تم ان سے زمین اور سمندر کے سفر کی تاریکیوں میں راہ نمائی حاصل کر سکو۔ سورۂ واقعہ میں کہا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (۵۶/۷۵) نہیں! بات یوں نہیں جیسے تم اپنے ذہن میں خیال کئے ہو بات کچھ اور ہے اس کے لئے میں ستاروں کی گذرگاہوں (ان کے طلوع و غروب کے مواقع) کو شہادت میں پیش کرتا ہوں وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (۵۶/۷۶) اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گی کہ یہ شہادت کس قدر بنیادی اور رفیع الشان ہے۔ یہ شہادت کس امر کی ہے؟ اس امر کی کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۵۶/۷۷) یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کہ یہ قرآن نوع انسانی کے لئے بڑا ہی نفع رساں اور عزت بخش ہے فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۶/۷۸) اس کے حقائق غیر متبدل ہیں اور وہ خود بھی ایک محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ اس لئے اس کے حروف و الفاظ میں بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ حقائق کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں تبدیلی ہو جائے تو حقائق میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کا صحیح مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب ان الفاظ

کو خالی الذہن ہو کر سمجھا جائے۔ اگر انسان پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی خاص خیالات اور تصورات لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآنی حقائق اپنی اصلی اور بلا آمیزش شکل میں سامنے نہیں آسکیں گے۔ اس لئے تطہیرِ فکر و نظر نہایت ضروری ہے لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَھَّرُوۡنَ (۵۶/۷۹)، اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو۔ جن کا ادراک بے رنگ ہو۔

قرآن سمجھنے کا طریقہ

پھر جس طرح ستاروں کی راہ نمائی تمام اقوامِ عالم اور جملہ ممالک دنیا کے لئے یکساں ہے اسی طرح، قرآن کی راہ نمائی بھی زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز اور تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے کہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو پورے عالمِ انسانیت کا نشو و نما دینے والا ہے تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۵۶/۸۰)، اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اَفَبِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡهِنُوۡنَ (۵۶/۸۱)۔ ذرا سوچو کہ تم اس قسم کے محکم، غیر متبدل، یقینی۔ ستاروں کی طرح واضح اور روشن ضابطۂ حیات کو جھٹلاتے ہو؟ اسے اِدھر اُدھر پھسلانا چاہتے ہو اس میں کمی بیشی کرکے، مداہنت اور مفاہمت (Compromise) کی راہیں تراشنے کی کوشش کرتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ اس میں تمہاری مرضی کے مطابق تھوڑا اسا رد و بدل کر دیا جائے! بتاؤ کہ اگر ستارے، لوگوں کی خواہش کے مطابق اپنے راستے بدلنے لگ جائیں تو راستہ چلنے والوں کا کیا حشر ہو؟

اور ایسی روش تم اختیار کیوں کرتے ہو؟ محض اس لئے کہ تم نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے لئے ذریعۂ معاش (روٹی کا آسرا) بنا رکھا ہے اور قرآنی مسلک اختیار کرنے سے وہ چیز چھن جاتی ہے؟ وَ تَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَکُمۡ اَنَّکُمۡ تُکَذِّبُوۡنَ (۵۶/۸۲) ذرا سوچو کہ کس قدر پست مقصد کی خاطر تم اتنی بلند حقیقت کو جھٹلاتے اور اس سے مداہنت اختیار کرتے ہو؟

اسی طرح سورۂ تکویر میں ہے فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ۔ میں یہ باتیں یونہی بیان نہیں کر رہا۔ اس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے۔ اس پر شاہد ہیں وہ ستارے جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں اَلۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ اور وہ تیز خرام ستارے جو اپنی اپنی منزل طے کرکے چھپ جاتے ہیں وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ اور رات جو خاموشی سے آتی ہے اور خاموشی سے چلی جاتی ہے وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱/۱۵-۱۸) اور صبح جب وہ حیاتِ نو کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہرِ کائنات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ۔ جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے۔ اور نہایت معزز پیغامبر ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ (۸۱/۱۹-۲۰) اسے اس خدا کی طرف سے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کا مالک ہے۔

بہر حال یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن نے اس صحرانشین قوم کو اتنی بلند اور ایسی لطیف حقیقت سے آگاہ کیا،

ماہرینِ فلکیات کا اعتراف

اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ ستاروں کی اپنی گذرگاہوں سے دورِ حاضر کے بلند پایہ سائنسداں کس طرح ان حقائق تک پہنچے ہیں تو (زیادہ نہیں تو کم ازکم) سر جیمز جینس کی مشہور کتاب (The Mysterious Universe) یا The Starry Way Of Heavens) کو دیکھیے اور غور کیجئے کہ عصرِ حاضر کا یہ سب سے بڑا ماہرِ افلاکیات، اس محیر العقول کارگۂ سماوی کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد، خدا کے بلند و بالا قانون کی عظمت و جلال کے سامنے کس طرح سجدہ ریز ہوتا ہے۔ وہ ان اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتا ہے کہ قانونِ خداوندی کے محکم اور غیر متبدل ہونے پر ستاروں کی شہادت فی الواقعہ ایک عظیم شہادت ہے وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ۔

ہمارے معاشرہ کی حالت

اب برادران! آگے بڑھیے۔ ہمارے ہاں معاشرہ کی جو حالت ہو رہی ہے۔ وہ سب پر عیاں ہے۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کا احترام بہت کم رہ گیا ہے قانون کی کتابوں کو دیکھئے تو وہ اعلٰے درجے کے قوانین سے بھری پڑی ہیں لیکن افرادِ معاشرہ کو دیکھئے تو قانون پر عمل بہت کم ہو رہا ہے۔ چوری نہ کرو، جھوٹ نہ بولو۔ کسی کو فریب نہ دو۔ کسی سے "چار سو بیس" نہ کرو۔ بلیک مارکٹ سے مجتنب رہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمام قوانین اور ہدایات موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ ان پر عمل نہیں ہوتا، حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو شخص دیانتدار اور صداقت پسند رہنا چاہے اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ اس صورتِ حالات کا تذکرہ کسی ذمہ دار اہلِ حل و عقد سے کیجئے وہ فوراً کہدیگا کہ کیا کیا جائے؟ قانون تو موجود ہے لیکن اس کے نافذ کرنے کی مشنری بہت کمزور اور ناقص ہو چکی ہے۔ اسلئے معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہے۔

قانون کے ساتھ قوت

اس سے ظاہر ہے برادران! کہ صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں۔ اس قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ کا ہونا بھی ازبس ناگزیر ہے۔ اگر قوتِ نافذہ کمزور ہو تو قانون کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اپنے معاشرہ کے برعکس، آپ خارجی کائنات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ وہاں فطری قوانین کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں فلک کی پہنائیوں میں تیرنے والے ان عظیم کروں کو دیکھئے۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں کس نظم و ضبط کے ساتھ

مصروفِ سعی و عمل ہے۔ ماہرینِ افلاک کا کہنا ہے کہ یہ کہکشاں، جو ہمیں محض گردِ مرمریں یا جوئے شیر نظر آتی ہے سیاروں اور ستاروں (ثوابت و سیار) کی ایک عظیم کائنات ہے جس میں ایک ایک کرہ، نہ صرف سورج بلکہ پورے نظامِ شمسی سے اس قدر بڑا ہے جیسے تل کے سامنے پہاڑ۔ یہ تمام محیر العقول کارگہ، اور اس کی یہ ہوش ربا مشینری روزِ اول سے آج تک، غیر مرئی اور نامحسوس باہمی کشش کے ذریعے، اس حدود ناآشنا فضا میں لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے، مصروفِ حرکت ہے لیکن کیا مجال جو اس میں کبھی ذرا سا بھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے! اس "کارگہ شیشہ گراں" کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کرورہا کرورا جرامِ فلکی میں سے کسی ایک میں ایک ذرے کے برابر بھی کشش میں کمی، یا اس کی رفتار میں تیزی یا سستی واقع ہو جائے تو یہ سارے کا سارا نظام ایک لمحہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

آسمانوں سے نیچے اتر کر اپنی زمین کی طرف آیئے تو قانونِ خداوندی کی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی نگہ بصیرت کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایک ہی قطعۂ زمین میں برابر برابر ببول اور آم کے بیج ڈال دیجئے۔ وہی مٹی ہے وہی پانی۔ وہی ہوا ہے وہی روشنی۔ وہی برودت ہے وہی حرارت۔ لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ببول کے تخم سے آم کا پیڑ اُگ آیا ہو اور آم کے درخت میں ببول کے کانٹے لگ گئے ہوں۔ آپ غور کیجئے برادرانِ اکرم جس ہستی نے کائنات کے لئے ایسے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں وہ کس قدر صاحبِ اقتدار و جبروت ہے کہ ہر قانون اپنا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کئے جا رہا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جب اُسی خدا کے قوانین (جو وحی کی رو سے ملیں) انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہو جائیں تو وہ کس طرح اپنے صحیح صحیح نتائج بحسن و خوبی پیدا کرتے چلے جائیں گے؟ اس حقیقت کے اظہار کے لئے سورۂ والنجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا کہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵۳/۵) نبی کو اس وحی کا علم اس ہستی نے دیا ہے جو بڑی زبردست قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱/۵۸) ہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق چلے۔ اسے ان قوانین کے نتائج و ثمرات نصیب نہ ہوں۔ وہ ان نتائج سے ضرور بہرہ یاب ہوگا لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ (۳۹/۲۰) اللہ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہا کرتے ہیں۔

اب اور آگے چلئے۔

کائنات کی مشینری کا ہر پرزہ اس لئے مصروفِ سرگردانی ہے کہ ہر شے کی مضمر صلاحیتوں (Potentialities) کی پوری پوری نشوونما (Development) ہو سکے۔ ابر و باد و مہ و خورشید سب اس لئے مصروفِ کار ہیں کہ دانہ کا ایک ننھا سا دانہ پودا بن کر سات سات سو دانے پیدا کرے۔ یہ اس دانے کی تقدیر یا (Destiny) ہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے۔ یہ اس کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔ لہٰذا خدا کا کائناتی

ہر شے کی ربوبیت

قانون اس حسن و خوبی سے اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر شے کی ربوبیت (پرورش نشوونما) ہوتی چلی جائے۔ وہ اپنے نقطۂ آخریں تک جا پہنچے۔ اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوجائے۔

لیکن اشیائے کائنات کی نشوونما، قانون ارتقاء (Evolution) کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے، ہر آن سلسلۂ ارتقاء کی ایک نئی منزل (Stage) میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں اس کی نشوونما کے تقاضے، اس کی سابقہ منزل سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا قانونِ ربوبیت ایسا ہے کہ کوئی شے جس حالت میں ہو وہ اس کے مطابق سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے یَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اپنی نشوونما کے لئے سب خدا (کی ربوبیت) کے محتاج ہیں۔ اور ان میں سے ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵/۲۹) وہ ہر آن میں ایک نئے انداز کو لئے ہوتی ہے جس میں اس کی پرورش کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اس کے قانونِ ربوبیت کا کمال ہے کہ جو شے جس حالت میں ہو وہ اسی کے مطابق اس کی نشوونما کا سامان عطا کر دیتا ہے

بدلتے ہوئے تقاضے

بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ دودھ شروع میں بہت پتلا ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں بچے کو زیادہ غذا (Nourishment) کی ضرورت ہوتی ہے دودھ میں غذا کے اجزا زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پانی کی مقدار کم۔ اس کے ساتھ ہی بچے کے معدے میں ہضم کی قوت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ تاکہ وہ ثقیل دودھ کو جزو بدن بنا سکے۔ پھر جب وہ خارجی غذا ہضم کرنے کے قابل ہوجاتا ہے تو اسے دانت دیدیئے جاتے ہیں۔ اور دودھ کی نہریں خشک ہوجاتی ہیں۔ وقس علیٰ ذالک۔ ہر شے کو اسکے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما ملتا چلا جاتا ہے۔

جس طرح طبعی دنیا میں نشوونما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح انسانیت کی دنیا میں بھی نشوو ارتقاء کے تقاضوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اگر آج افریقہ کے حبشی اپنے جوہر انسانیت کی نشوونما کے لئے نظام خداوندی کو اختیار کریں تو ان کی نشوونما کے تقاضے اور ہوں گے۔ اور اگر یورپ کی متمدن اقوام یہی کچھ چاہیں تو ان کے تقاضے اُن سے مختلف ہوں گے۔ لہٰذا انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیے، جو انسانی ذات کے مستقل جوہروں کی پرورش اور بالیدگی زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرتا چلا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ وحی کا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں محکم اور یقینی واقع ہوا ہے۔ اُس خدا کا قانون ہے جو ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳/۶) ہے۔ یعنی زندگی کی تمام گذرگاہوں کا مالک۔ زمان اور مکان، دونوں اعتبار سے انسانی زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ان کی نشوونما کا پورا پورا انتظام کرنے والا۔ ربّ العالمین۔

مقامِ محمدی کا آغاز

یہاں تک برادران! گفتگو وحی یا اس خدا کے متعلق ہو رہی تھی جو وحی کو عطا کرتا ہے۔ اب اُس گراں مایہ ہستی کا تذکرہ آتا ہے جس کا منور و مقدس سینہ وحی کا مہبط بنتا ہے۔ یعنی خود نبی کا تذکرہ۔ لہٰذا یہاں سے مقامِ نبوت یا مقامِ محمدی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ذوق وانہماک کی ضرورت ہے۔ نہ صرف ذوق وانہماک کی بلکہ تعظیم واحترام کی بھی کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

وما توفیق الا باللہ العلی العظیم۔

آجکل ہم (مسلمانوں) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے۔ اور بس۔ یعنی جب وہ پیغامِ خداوندی کو دوسروں تک

مقامِ نبوت کے متعلق ایک عظیم غلطی

پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو کے سٹ کی سی ہوتی ہے۔ جو کچھ براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے براڈ کاسٹ (نشر) ہوتا ہے، یہ سیٹ اسے اخذ کر لیتا ہے۔ اور بعینہٖ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ جب براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے کچھ نشر نہیں ہوتا تو ریڈیو محض ایک لکڑی کا ڈبہ رہ جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگوں کو ایک اور غلطی بھی لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وحی چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے۔ یعنی وحی میں نبی کے اپنے کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے نبی میں کسی ذاتی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا نے اپنی وحی کسی نہ کسی کے ذریعے انسانوں تک پہنچانی ہوتی ہے اس لئے اس مقصد کے لئے جو انسان بھی اس کے سامنے آجائے وہ اس کے ذریعے وحی کو انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہے وہ خیال جس کا مظہر وہ شعر ہے جو ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے اور جسے عام طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یعنی

خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یعنی اللہ تعالےٰ کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آچکا تھا کہ خدا کی وحی بنی اسرائیل تک پہنچا دی جاتی۔ اُس وقت اتفاق سے حضرت موسےٰ آگ کی تلاش میں اُدھر آنکلے تو اللہ میاں نے تاجِ نبوت ان کے سر پر رکھ دیا۔ اگر اس وقت ان کی جگہ کوئی اور وہاں جا پہنچتا تو یہی پیمبری اسے مل جاتی!

یہ خیال بھی بنیادی طور پر غلط ہے اور مقامِ نبوت سے یکسر بے خبری کا نتیجہ۔ اس کے ازالہ کے لئے خود حضرت موسیٰ ہی کی مثال لیجئے (جن کے متعلق نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آگ لینے کو گئے اور پیغمبری مل گئی!) سنئے کہ اللہ تعالےٰ ان کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے سلسلہ میں کیا کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ کو وحی سے نواز گیا اور فرعون کے خلاف جس مہم پر جانے کے لئے ان سے کہا گیا تھا۔ اس کے لئے ان کی

نبی کی تربیت

طرف سے پیش کردہ متعدد درخواستیں منظور کر لی گئیں تو حضرت موسےٰ کا سر (فطری طور پر) احساس سپاس گذاری سے بدرگاہِ رب العزت جھک گیا۔ اُس وقت آپ سے کہا گیا کہ "اے موسیٰ! تم نے اس کو ہمارا احسان سمجھا اور اس کے لئے جذباتِ تشکر تمہارے آبگینۂ قلب سے ابھر آئے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سلسلۂ احسانات کب سے شروع ہے؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہوگا۔ یہ سلسلہ اُسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب تم پیدا ہوئے تھے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (۲۰/۳۷) جب ہم نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں لٹا کر دریا میں بہا دے۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور تمہارا صندوق فرعون کے محلات میں جا پہنچا۔ اس طرح ہم نے اس کا انتظام کر دیا کہ تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہو۔ تم نے بڑے ہو کر (بنی بنکر) فرعون سے ٹکر لینی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم رموزِ سلطنت اور اسرارِ حکومت سے واقف ہوتے۔ لیکن تم ایک محکوم قوم (بنی اسرائیل) کے فرد تھے۔ اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک پہنچنا ناممکن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش و تربیت خود محلاتِ شاہی میں ہو۔ تم نے ساری عمر شاہزادگی یا شاہنشاہی کی زندگی بسر نہیں کرنی تھی۔ تمہاری پیدائش سے مقصود کچھ اور تھا۔ تم نے ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر وادیٔ سینا کے جنگلوں پہاڑوں اور بیابانوں میں بھی جانا تھا اور وہاں ان کی تربیت کرنی تھی۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی زندگی سے بھی واقف ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی محلات کو چھوڑ کر مدین کی طرف بھاگ نکلو ثُمَّ لَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ (۲۰/۴۰) سو تم کئی برس اہلِ مدین میں رہے۔

اس طرح جب تم ان تمام مختلف مراحل سے گذرے تو ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ (۲۰/۴۰) تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پورے اترے وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۰/۴۱) اس طرح ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے بہ کمالِ حسن و خوبی تیار کیا اور جب تم اس طرح اس مقصدِ بلند کے قابل ہو گئے تو تمہیں وحی عطا ہوئی یہ نہیں کہ تم یونہی آگ لینے کو ادھر آ نکلے اور ہم نے نبوت کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہونیوالے نبی کو پہلے ہی دن سے منصبِ نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود اس کا علم نہیں ہوتا وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (۴۲/۵۲) اس لئے کہ نبی

کے اپنے کسب و ہنر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی کے سینے کو ایسی گراں بہا متاع کا امین بننے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں کیا کیا خصوصیتیں پیدا ہوئی تھیں، سورۃ والنجم کی اگلی آیات میں ان کا ذکر ہے۔ اس کے لئے قرآن نے سب سے پہلے ایک لفظ استعمال

فاستوی

کیا ہے فَاسْتَوٰی (۵۳/۶) دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے یہ اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کے معراجِ کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لئے یوں سمجھئے جیسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کہتے ہیں (Balanced Personality) وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشو و نما پا کر، پورے پورے اعتدال اور حسنِ توازن و تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔ جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ برادران! آپ سوچئے کہ ارتقائے شرفِ انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ پہلی خصوصیتِ کبریٰ جس سے مقامِ محمدیؐ کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی حسنِ سیرت کی کمالِ زیبائی و رعنائی۔ مختلف صفاتِ انسانیہ کا پورا پورا اعتدال خدا نے خود اپنے متعلق جو اسماء الحسنیٰ کہا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی وہ ذات جس میں تمام صفات (اسماء) اپنی مکمل صورت میں بایں انداز جمع ہوں کہ ان میں پورا پورا تناسب پایا جائے۔ تناسب Proportion کا اعتدال ہی درحقیقت حسن ہے۔ حسنِ عمل بھی وہی ہے جس میں صحیح صحیح تناسب و اعتدال ہو۔ صحیح اعمال وہ ہیں جن میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ لیکن ان میں اعتدال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ تمام صفات کامل اعتدال کے ساتھ حسن کارانہ انداز سے خدا کی ذات میں جمع ہیں۔ اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو۔ یعنی اپنی ذات میں انہی صفات کو اجاگر کرو۔ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰) اور جو لوگ اس کی صفات میں (افراط و تفریط سے) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں اعتدال پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی ایک صفتِ خداوندی میں بھی اعتدال کا دامن چھوڑ کر افراط اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ صحیح راستے پر نہیں۔ یہاں "الحاد فی الاسماء" کہا ہے سورۃ حٰم سجدہ میں الحاد فی الآیات۔ یعنی آیاتِ خداوندی میں بھی کسی ایک طرف نکل جانے کو باطل کی راہ کہا ہے (۴۱/۴۰) مومن وہ ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ یعنی توازن بدوش راہ پر جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ یہی لوگ منعم علیہ ہیں۔ یعنی جنھیں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہیں۔ اسی درخشندہ فہرست کا سرِ عنوان "مقامِ محمدیؐ" ہے جسے قرآن نے فاستوی سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حدِ بشریت) پورے پورے اعتدال کے ساتھ لئے ہونے۔ یہ ہوا سیرت کا کمال۔ اب آگے بڑھیئے۔ ارشاد ہے وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳/۷)، افق کے معنی

علم کی بلندی

(Horizon) یا زمین کے آخری کنارے کے ہیں۔ اس میں وسعت کی انتہا آجاتی ہے اور جب اس کے ساتھ اعلیٰ کا لفظ آجائے تو اس میں وسعتیں اور بلندیاں دونوں شامل ہو جاتی ہیں۔ آپ سطح زمین پر کھڑے ہوں تو آپ کی افق (وسعتِ نگاہ) بہت قریب ہوگی۔ آپ کسی اونچی عمارت پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کی افق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور جب آپ کسی بلند ترین (اعلیٰ) مقام پر کھڑے ہوں تو یہ وسعت اپنی انتہا تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا ھو بالا فق الاعلیٰ سے مراد یہ ہے کہ نبی کا علم اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر نبی کے معنی "پیش گوئیاں کرنے والا یا خبریں دینے والا" کئے جاتے ہیں (یعنی اسے نبأ سے مشتق مانا جاتا ہے)۔ نبوت کا یہ تصور درحقیقت یہودیوں کے ہاں سے آیا ہے۔ ان کے ہاں ہیکل (معبد) میں ایک بلند منصب کا حامل نبی کہلاتا تھا جس کا کام لوگوں کو آنیوالے واقعات کے متعلق خبریں دینا (یا ان کی قسمت اور تقدیر بتانا) تھا۔ چنانچہ یہودی لٹریچر میں جن نبیوں کے قصے درج ہیں، وہ بالعموم ہیکل کے انہی منصب داروں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ (نبی) کا ترجمہ (Prophet) ہوا۔ یعنی (Prophecies) پیش گوئیاں کرنے والا۔

نبی کے معنی

لیکن قرآن کی رو سے نبی کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ نبوۃ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لہٰذا نبی کے معنی ہیں وہ جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ ھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی یا اُفُقِ الْمُبِیْنِ (۸۱/۲۳) ان معانی کی وضاحت خود نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دی۔ جب آپ کو حکم ملا کہ خدا کا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچائیں تو آپؐ مکہ سے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گئے اور لوگوں کو (بالخصوص اپنے اہل خاندان کو) بلایا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اِس پہاڑی کی دوسری طرف ایک لشکر جرار ہے جو تم پر چڑھائی کرنے کے لئے بڑھے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اسے ضرور سچ مانیں گے۔ آپ نے پوچھا کہ تم اسے سچ کیوں مانو گے؟ انھوں نے کہا کہ ایک تو اس لئے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر برادران! ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ انھوں نے کہا کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک بننے والے نبی کی زندگی، نبوت سے پہلے بھی کس قسم کی ہوتی ہے؟ اس قسم کی کہ وہ اپنی قوم میں صادق اور امین مشہور ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ایک پاکباز اور دیانتدار انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسی پاکباز اور دیانتدارانہ زندگی کہ وہ اسے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ نے نبوت کا دعوے کیا تو آپ کی قوم نے کہا کہ آپ کوئی معجزہ دکھایئے تاکہ ہم یقین کریں کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم مجھے جانتے نہ ہو۔ میں نے اس دعوے سے قبل ساری عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر صداقت اور دیانت سے گذاری ہو کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ہی رات میں یوں بدل جائے کہ اتنے بڑے جھوٹ اور فریب پر اتر آئے! لہٰذا میری گذشتہ زندگی میرے دعوے کی صداقت پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

ہاں! تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات کا اس لئے یقین کر لیں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور دوسرے اس لئے کہ آپ اُس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑی کے اُس طرف بھی دیکھ سکتے ہیں اور اِس طرف بھی۔ اور ہم اُس جگہ ہیں جہاں سے ہم اُس طرف دیکھ سکنے کے قابل نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خدا نے علم کی اُس بلندی پر فائز کیا ہے۔ جہاں سے میں اُس دنیا کو بھی دیکھ سکتا ہوں جہاں سے حقائقِ کائنات ابھرتے ہیں۔ اور اِس دنیا کو بھی جہاں یہ منطبق (Apply) ہوتے ہیں۔ اسے مقامِ نبوت یا وحی خداوندی کہتے ہیں۔

یہی ہے برادرانِ عزیز! وہ اُفُقِ الاَعلیٰ جس پر نبی فائز ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ اُس دنیا کو بھی دیکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کی نگاہوں، بلکہ قیاس و خیال و گمان و وہم تک سے اوجھل ہے۔ اور اِس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ہیں۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ہوتا ہے۔

اب اگلی آیت کی طرف آیئے! آپ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز (مفکرین) کی زندگی کو دیکھئے۔ بالعموم آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ان کے افکار (THOUGHTS) بہت بلند ہوں گے۔ وہ کائنات کے عظیم حقائق سے بحث کریں گے۔ لیکن ان حقائق کی جھلک اِن کی اپنی سیرت و کردار میں بہت کم دکھائی دیگی

فکر و عمل میں مطابقت

یعنی ان کی فکر، ان کے ادراک (Intellect) کی بلندی اور ان کی عملی زندگی میں بہت بُعد ہوگا۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ علم کے افقِ اعلیٰ پر فائز ہونے کے ساتھ عملاً بھی حقائقِ کائنات سے بہت قریب ہوتا ہے (ثُمَّ دَنَا ۵۲) ان حقائق میں اور اس کی اپنی زندگی میں قطعاً بُعد نہیں ہوتا۔

حقائق کی گہرائیوں میں

زندگی کو ان حقائق سے ہم آہنگ کرنیکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حقائق کا صرف فکری اور نظری طور پر ہی ادراک نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے (فَتَدَلّٰی ۵۳) وہ ضمیرِ کائنات کے عُمق (Depths) تک جا پہنچتا ہے۔

جوڈ (Joad) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر (یعنی فلاسفر) ہوتا ہے

اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ (Creative Genius) ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس ذات میں علم کی بلندیاں، حقائق کی وسعتیں اور تخلیقی جذبات کی گہرائیاں اپنے انتہائی اعتدال کے ساتھ یکجا جمع ہوں، اُسے نبی کہا جاتا ہے۔

یہ ہے برادران! علم و جذبات و کردار کے اعتبار سے مقام محمدی کی ایک جھلک جو قرآن کے ان درخشندہ موتیوں میں اس طرح جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔

نبی کا فریضہ اب یہ دیکھئے کہ اس قدر عظیم علم (وحی) پانے کے بعد نبی کا فریضہ کیا قرار پاتا ہے! اس کا منصب کیا ہوتا ہے! یہیں سے یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ نبی محض (معاذ اللہ) ایک آلۂ ابلاغ (پیغام پہنچانے والا ریڈیو سیٹ) نہیں ہوتا۔ اس کا مشن اس سے آگے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

آپ میں سے اکثر احباب، علامہ اقبال کے مجموعۂ خطبات (Lectures) سے واقف ہوں گے۔ انھوں نے اپنے پانچویں لیکچر کا افتتاح اس طرح کیا ہے۔

محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچکر واپس تشریف لے آئے خدا
شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعور نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہوجائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

(خطبات اقبال ص)

میں اس وقت برادران! ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے اور جس چیز کو کشف والہام کہا جاتا ہے ان کی ماہیت کیا! ان امور کے متعلق میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر لکھ چکا ہوں۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا

تصوف اور نبوت

کہ مقامِ نبوت (فلک الافلاک کی بلندیوں) تک پہنچنا تو ایک طرف، صوفی کا گذر ان دوائر میں بھی نہیں ہو سکتا جن سے وحی کا نزول ہوتا ہے۔ صوفی کے تمام کمالات اس کے اپنے کسب وہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں اس کے برعکس نبوت ایک یکسر وہبی عملیہ ہے۔ جس میں نبی کے اپنے کسب وہنر (تو ایک طرف) اختیار وارادہ کو بھی دخل نہیں ہوتا جس چیز کو تصوف کی دنیا میں روحانی ترقی سمجھا جاتا ہے۔ وہ دراصل انسان کی بعض نفسیاتی قوتوں کی بیداری اور نشوونما ہوتا ہے یہ اس کی اپنی داخلی قوتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس، وحی خارج سے انکشاف حقیقت کا نام ہے جسے نزول کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صوفی اس مقام تک پہنچ کر جہاں سے نبی کو وحی ملتی ہے واپس آسکتا ہے یا نہیں۔ جو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کی واپسی کا کیا ذکر! جس مقصد کیلئے میں نے اس اقتباس کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی پر انکشاف حقیقت ہوتا ہے (یعنی اسے وحی ملتی ہے) تو اس سے مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان حقائقِ مستور کے پرکیف مناظر سے ذاتی طور پر لذت اندوز ہوتا ہے اور ان کی حیرت انگیز کیفیات میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ صوفیوں کی طرح اسکی بھی (معاذ اللہ) یہ حالت ہو جائے کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آید

نبی کو وحی اس لئے نہیں ملتی اُسے وحی اسلئے ملتی ہے کہ وہ اسے لیکر انسانوں کی دنیا کی طرف آئے اور ظلم واستبداد کی ان تمام

رسالت کا فریضہ

طاغوتی قوتوں کو جو عالمِ انسانیت میں فساد برپا کر رہی ہوں، راستہ سے ہٹا کر انسانی معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے خطوط پر تشکیل کر دے۔ بالفاظ دیگر وہ عالمِ انسانیت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف (داستانِ حضرت موسیٰ میں) یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَ اَصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۰/۴۱) ہم نے تجھے (اے موسیٰ۔ اسطرح) اپنی ذات کے لئے تیار کیا۔ اس میں لِنَفْسِي کا ٹکڑہ قابل غور ہے گویا خدا کا ایک پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لئے اس نے صاحبِ ضربِ کلیم کو اس طرح (درجہ بدرجہ۔ منزل بہ منزل) تیار کیا۔ وہ پروگرام کیا تھا! اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۴۳) تم دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) فرعون کی طرف جاؤ۔ اسلئے کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے وہ حد سے نکل گیا ہے۔ یعنی ایک نبی کو وحی اسلئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم انسانیت کو مستبد اور سرکش قوتوں کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر خدا کے قوانین کے تابع لے آئے۔ یہ نقطہ برادران! ذرا مزید وضاحت کا

انسان اور کائنات میں فرق

متقاضی ہے۔ آپ نظامِ کائنات پر غور کیجئے۔ وہاں ہر شے خود بخود قوانینِ خداوندی کے مطابق مصروفِ کار ہے جس کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اس کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرداں وجنباں ہے۔ لیکن انسان کو چونکہ صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے اسلئے اسے اختیار حاصل ہے کہ یہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر کے دوسری روش پر چل نکلے۔ جب مستبد قوتیں

قانون خداوندی کے راستے کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق نظام قائم کر لیتی ہیں۔ تو زیر دست انسان ان کے پاؤں تلے بُری طرح روندے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات ان سرکش قوتوں کے اعمال کے نتائج مرتب کر رہا ہوتا ہے۔ اور ان نتائج کو ایک دن ان کے سامنے بھی آنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کچھ خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) ایک ایک دن ہزار ہزار سال (۲۲/۴۷) اور پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر خدا کے اس قانونِ مکافات کے ساتھ انسان کا ہاتھ بھی لگ جائے تو یہی نتائج انسانوں کے ماہ و سال کے حساب سے مرتب ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اور جن سرکش قوموں نے صدیوں کے بعد جا کر تباہ ہونا تھا وہ دنوں میں سرنگوں ہو کر وجہ نجاتِ انسانیت بن جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جب انسان خدا کا رفیق بن جائے تو پھر خدا کے پروگرام (مشیت) کی تکمیل انسانی حساب و شمار کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقامات پر باندازِ دگر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ۔ قانونِ خداوندی کے مطابق تدبیر امور کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ہر اسکیم کو اس کے پست ترین نقطہ سے شروع کرتا ہے۔ اور اسے اپنے نقطۂ آخریں تک پہنچا ہوتا ہے۔ وہ اسکیم اپنے نقطۂ آغاز سے بلند ہونا شروع ہوتی ہے ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵) اور اس طرح اوپر اٹھتی جاتی ہے (خدا کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے) ایک ایک ارتقائی مرحلہ میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اسی کو سورۂ فاطر میں یوں کہا گیا ہے کہ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ خوشگوار نظریۂ حیات اُس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اس کا یہ بلند ہونا، خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) اس کے آگے ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰) اور عمل صالح اسے رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یعنی ویسے تو وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتا ہی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسان کے اعمالِ صالح بھی شامل ہو جائیں یہ اس کی رفتار یا ترقی Speed or Progress کو تیز تر (Accelerate) کر دیتے ہیں انسان کی رفاقت کے بغیر وہ صرف اپنے زورِ دروں سے اوپر چڑھتا تھا۔ اس کی رفاقت اسے خارجی قوت کا سہارا دے کر جلد تر بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا اور انسان کا یہ حسین تعلق (یعنی رشتۂ رفاقت) وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں ان الفاظ سے اشارہ فرمایا کہ بل الرفیق الاعلیٰ۔ خدا رفیق اعلیٰ ہے۔ یعنی اس پروگرام کی تکمیل میں انسان رفیق ادنیٰ ہوتا ہے اور خدا رفیق اعلیٰ۔ لیکن تعلق ان کا رفاقت ہی کا ہوتا ہے۔

اس پس منظر کی روشنی میں آگے بڑھیئے۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو دوست آپس میں گہری رفاقت کا معاہدہ کرتے تو وہ دونوں اپنی اپنی کمانیں ملاتے اس طرح کہ دونوں کا چلّہ ایک ہو جاتا۔ یعنی وہ کمانیں تو دو ہوتیں لیکن ان کا چلّہ ایک ہوتا۔ اس چلّہ میں

قابِ قوسین

ایک تیر رکھتے۔ ان میں سے ایک کمان کو کھینچتا اور دوسرا چلّہ کو۔ اور اس طرح دونوں مل کر تیر چلاتے۔ اس محکم معاہدۂ رفاقت کو وہ قاب قوسین (دو کمانوں کے ایک چلّہ) سے تعبیر کرتے۔

قرآن نے کہا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں شرفِ انسانیت کے مختلف عناصر یکجا جمع ہو کر اعتدال تک پہنچ گئے اور علم و حقائق کی دنیا میں آپ کو انتہائی بلندیاں، وسعتیں اور گہرائیاں حاصل ہو گئیں تو اسکے بعد فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (۵۳/۹) آپ کا خدا کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ رسول اللہ نے خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا اس عہد و پیمان کے بعد وہ انسانوں کی دنیا کی طرف تشریف لائے۔ حالی کے سادہ اور حسین الفاظ میں یہ داعیٔ انقلاب، تاجِ نبوت سے سرفرازی کے بعد۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نبوت اس منصب کو کہیں گے جس کی رو سے نبی کو وحی ملتی ہے اور رسالت وہ منصب ہے جس کی رو سے وہ وحی کی روشنی میں انسانی معاشرہ میں آسمانی انقلاب پیدا کرتا اور اسطرح عملاً وحی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں وہ قطعاً بخل نہیں برتتا وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۸۱/۲۴) اس اعتبار سے نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں رسول کہہ کر۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اسے کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب نہ ہو اور رسول اسے جسے کتاب ملی ہو۔ قرآن سے یکسر لاعلمی کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے ہر نبی یعنی ہر رسول کو کتاب ملتی تھی۔ (دیکھئے ۲/۲۱۳ ؛ ۵۷/۲۵)

ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک نبی، وحی کی جگمگاتی قندیل کو ہاتھ میں لئے دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے۔ تاکہ انسانی معاشرہ کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کر کے خدا کے پروگرام کی تکمیل کرے۔ اور جس طرح اس کی بادشاہت آسمانوں (خارجی کائنات) میں ہے اسی طرح زمین پر بھی اسکی حکومت قائم ہو جائے۔ اس طرح رسولؐ اور اسکے ساتھی خدا کے انصار اور رفیق بن جاتے ہیں۔ اب جو کام ان کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں، انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے (مثلاً) جنگِ بدر میں جو تلواریں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے اٹھیں اور جو تیر اُن کی کمانوں سے نکلے ان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وہ کچھ خود ہم نے کیا تھا فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸/۱۷) تم نے انھیں قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے ان پر تیر اندازی نہیں کی۔ خود اللہ نے کی ہے۔ برادرانِ عزیز! غور کیجئے کہ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ کی کیسی دلنشین پیرایہ میں تشریح کی گئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است — لیکن کشود آں ز کمانِ محمدؐ است

مقامِ رسالت کی اس سے بہتر انداز میں تصویر کشی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

مقامِ عبدیت

علم و عمل کے ان تمام بلند ترین گوشوں کو سامنے لانے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (۵۳/۱۰) جب یہ عبد (نبی اکرمؐ) اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا! یہ مرتبۂ بلند ہر کسی کو نہیں مل جایا کرتا۔ اتنی عظیم خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہ سینہ جسے وحی کا مہبط بننا ہوتا

ہے۔ آپ نے غور کیا برادران! کہ قرآن نے حضورؐ کے لئے عبدہ کا لفظ اس مقام پر جا کر استعمال کیا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مقامِ عبدیت کیا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جس کے تصور سے نگاہوں میں چمک، ذہن میں جلا اور قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر کتنا بلند ہے مقامِ عبدیت۔ آپ دیکھئے گا کہ قرآن نے جہاں نزولِ وحی کا ذکر کیا ہے وہاں عام طور پر عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (۱۸/۱) تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ (۲۵/۱) هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (۵۷/۹) اسی لئے قرآن نے ہر رسول کو عبد کہا ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ ایک شخص خواب میں کچھ محیر العقول باتیں دیکھتا ہے جب اسکی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر پر خود ہی ہنس دیتا ہے اسلئے کہ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی باتیں کبھی فی الواقعہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی جن حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی جو علم اسے وحی کی بنا پر حاصل ہوتا ہے وہ خواب کا سا علم نہیں ہوتا کہ آنکھیں دیکھیں اور دل اسکی تردید کرے اس کا دیکھنا علم و یقین کا دیکھنا ہوتا ہے جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اسکی کبھی تکذیب نہیں کرتا وَمَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (۵۳/۱۱) یہی وجہ ہے کہ نبی اپنی وحی پر سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۲/۲۸۵) جو کچھ اسکے رب کیطرف سے اس پر اتارا جاتا ہے رسول (سب سے پہلے) خود اس پر ایمان لاتا ہے۔ اور پھر باقی مومنین اسلئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۳) میں سب سے پہلے اپنی وحی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

دل کی تصدیق

قرآن نے اس مقام پر ایمان کیلئے دل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے سورۂ منافقین میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورت کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (اے رسول) جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اسکے بعد ہے وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ اور اللہ کو اس کا علم ہے کہ تو یقیناً اس کا رسول ہے اس سے ظاہر ہے کہ منافقین ایسی بات کہتے ہیں جو امرِ واقعہ ہے اور جسکی شہادت خود اللہ دے رہا ہے اسلئے منافقین کے سچا ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اسکے آگے ہے کہ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳/۱) اور اللہ اسکی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے اور کیسے دلنشین پیرایہ میں۔ اس نے کہا ہے کہ منافقین زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل سچی حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا دل اسکی شہادت نہیں دیتا اسلئے یہ جھوٹے ہیں اس سے قرآن نے کذب کی ایک واضح اور محکم تعریف بیان کر دی ہے یعنی جب تک کسی کا قلب و زبان ہم آہنگ نہ ہو اسے سچا نہیں کہہ سکتے۔ کذب وہ ہے جس میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ایک شخص زبان سے ایک ایسی بات کہتا ہے جو بالکل سچی ہے لیکن اگر اس کا دل اسکی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کاذب ہے۔ صادق نہیں ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

Definition

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا — لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ایمان یہ ہے کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (۵۳/۱۱) جو کچھ آنکھیں دیکھیں دل اسکی تکذیب نہ کرے نبی اپنی وحی پر اسی طرح ایمان لاتا ہے۔ وہ حقائق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اسکے بعد قرآن ضمناً ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو نبی کی اس وحی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ہمیشہ کہتے یہ ہو کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن علاً تمہاری حالت یہ ہے کہ تم رسول سے اس بات پر جھگڑتے ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرتا ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی کتنی بڑی ہے تمہاری بھول اور کس قدر غیر معقول ہے تمہاری یہ مخالفت! اس ضمنی گوشے کے بعد قرآن پھر اسی موضوع پر آ جاتا ہے اور اگلی آیت میں ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا حسی مشاہدہ ہوتا ہے

وحی اور خواب

اسی چیز کو اس نے باندازِ دگر بیان کیا ہے۔ خواب کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ آپ کسی خواب کو انہی تفاصیل و جزئیات، ربط اور تسلسل کے ساتھ کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اُسے خواب مت سمجھو۔ اسلئے کہ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۵۳/۱۳) اس نے اُسے بارِ دگر بھی دیکھا ہے، اور فی الحقیقت (لَقَدْ رَاٰهُ) دیکھا ہے۔ اسلئے اس کا یہ دیکھنا خواب کا دیکھنا نہیں۔ جو لوگ وحی کو خواب پر محمول کرتے ہیں، یا خوابوں کو از قبیلِ وحی تصور کرتے ہیں انہیں دیکھنا چاہیئے کہ یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے۔ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔ اسکے بعد قرآن وحی کے ایک اور بنیادی گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ ایک طرف جذبات پرست ہیں جو خوابوں کو بھی از قبیلِ وحی قرار دیتے ہیں دُوسری طرف عام مفکرین (فلاسفرز) ہیں جن کا خیال ہے کہ وحی انسانی فکر (Intellect) ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ برگسان نے وجدان Intuition کے متعلق کہا ہے کہ وہ فکر ہی کی بلند سطح Higher Form Of Intellect ہے چنانچہ بعض لوگ وجدان کو وحی پر محمول کر لیتے ہیں مغربی مفکرین کا رجحان اسی طرف ہے۔ قرآن نے جہاں اس تصور کی تردید کی ہے کہ خواب بھی وحی ہوتے ہیں وہیں واضح الفاظ میں اس کا بھی اعلان کر دیا کہ وحی فکرِ انسانی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقلِ انسانی کے لئے حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۱۴) نبی نے ان حقائق کو سدرۃ المنتہی کے قریب دیکھا۔ عربوں میں اَلسَّادِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو شدتِ گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے۔ سَدِرَ بَصَرُهٗ سَدَرًا کے معنی ہیں گرمی کی شدت کی وجہ سے اسکی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں[1]۔ اسلئے نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں عقلِ انسان کے لئے سوائے تحیر کی فراوانیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی عقل وہاں ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اسکے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس مقام اور اسکی کیفیات کا مشاہدہ یا اندازہ کر سکے۔

سدرۃ المنتہی

لیکن اگر عقلِ انسانی مقامِ وحی کی کنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتی تو اسکے یہ معنی نہیں کہ عقل وحی کے حقائق سے مستفید بھی نہیں ہو سکتی۔ وحی کی تعلیم انسان کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے بار بار تفکر و تدبر اور عقل و شعور سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اس تعلیم کا سمجھنا اسلئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اس پر عمل کرنا اسلئے ضروری ہے کہ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو سکے اور اسکے بعد کی زندگی بھی جنت کی ہو۔ ہٰذا یہی عقل جو مقامِ نبوت کی کنہ و حقیقت سمجھنے سے یکسر قاصر ہے وہ اگر وحی کے پیغام کی اتباع کرے تو جنت کی خوشگواریاں اسکے حصے میں آسکتی ہیں۔ اسلئے کہ مقامِ وحی اگر عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ہے تو عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۵۳/۱۵) جنت بھی اُسی کے پاس ہی ہے[2]۔ جو شخص عقل کی رُو سے مقامِ نبوت کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی سعیٔ لاحاصل کرتا ہے اسکے حصے میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص عقل و بصیرت کی رُو سے وحی کے پیغام کو عملی نظام میں متشکل کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے ساتھ باقی انسانیت کو جنت کی آغوش میں لے آتا ہے جہاں وہ اضطراب باقی نہیں رہتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم پر اسکے لئے وجۂ خلش بنتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے کہ فِىْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) ہونگے یعنی ان بیریوں کے نیچے جن کا سایہ آرام دہ اور پھل خوشگوار ہوں گے لیکن جن میں کانٹے نہیں ہونگے ایسی حیرت جس میں شکوک کی خلش نہ ہو۔ بہرحال، وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقلِ انسانی بار ہی نہیں پا سکتی۔ جہاں عام انسان کی آنکھ کیلئے ہر طرف تحیر ہی تحیر ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب ان تحیر کی وادیوں پر ہر طرف سے علمِ الٰہی چھایا ہوا ہوتا ہے (اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۵۳/۱۶) تو اس کی آنکھ اس مقام پر بھی ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتی مَا زَاغَ الْبَصَرُ (۵۳/۱۷) وہ ذرا نہیں جھپکتی۔ غور کیجئے کہ عقلِ انسانی اور نگہِ نبوی میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے یہ فرق درجہ (Degrees) یا کمیت کا Quantitative نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک ذرا نیچے ہے اور دوسری ذرا اوپر۔ یہ فرق اصلاً

---

[1] السِّدْرُ پانی کے منبع اور سرچشمہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سدرۃ المنتہی کے معنی علمِ الٰہی کے ہونگے جو تمام حقائق کا سرچشمہ ہے۔ [2] اگر سدرۃ المنتہی کے معنی علمِ الٰہی کے لئے جائیں تو عندھا جنۃ الماوٰی سے مراد یہ ہوگی کہ جن قوموں کی کشتِ امل وحیٔ الٰہی کے پانی سے سیراب ہو وہ جنت کی مالک ہوں گی۔

دنیا کا فرق ہوتا ہے۔ کمیت کی بجائے کیفیت Qualitative ہوتا ہے۔ عقل انسانی کسبِ ہنر سے اُس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی لیکن اُس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے نگہِ نبوت کا تقابل عقل انسانی سے۔ یعنی عقلِ انسانی کے مقابلہ میں نگہِ نبوت

علمِ نبوی کی حد

حدود فراموش ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا مقابلہ علمِ خداوندی سے کیا جائے تو علمِ نبوی لامحدود اور لامنتہا نہیں ہوتا۔ نبوت کی آنکھ اُس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جو اسکے لئے علمِ خداوندی نے مقرر کر رکھی ہو۔ اسلئے مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷)، وہ نگاہ جہاں تحیر کی ان فراوانیوں کے باوجود ذرا اپنے مقام سے ادھر ادھر نہیں ہوئی، وہاں وہ اُس حد سے بھی تجاوز نہیں کر سکی جو اس کے لئے متعین تھی۔ اسلئے کہ نبی کا علم (وحی) کتنا ہی بلند اور وسیع کیوں نہ ہو۔ وہ بہرحال خدا کا عطا کردہ اور علمِ خداوندی کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے انسانوں کے مقابلہ میں، وحی کا مقام وہ ہے جہاں انسانی علم و عقل کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن علمِ خداوندی کے مقابلہ میں یہ لامنتہا نہیں۔

مقامِ نبوت کے متعلق ان تصریحات کے بعد قرآن چند لفظوں میں بتاتا ہے کہ نبی اس مقامِ بلند پر پہنچکر دیکھتا کیا ہے؟ اس مقام پر قرآن نے وحی کی تفاصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھدیا ہے وہ کہتا ہے کہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی (۵۳/۱۸)، اُس نے اس مقام پر

آیاتِ کبریٰ

اپنے نشو و نما دینے والے کی آیاتِ کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ ان آیاتِ کبریٰ سے مراد کیا ہے؟ اسکے لئے پھر داستانِ حضرت موسےٰ کی طرف آیئے۔ جب حضرت موسیٰ کو طور کی چوٹیوں پر وحی سے نواز گیا تو اُن سے کہا گیا کہ یہ سب کچھ اسلئے کیا گیا ہے کہ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرَى (۲۰/۲۳)، تاکہ ہم تجھے اپنی آیاتِ الکبریٰ دکھائیں۔ اسکے بعد ہی اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)، فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے (حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے چھڑائے وہ اس مقصدِ عظیم کو لیکر آتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو قیامت خیز تصادمات کے بعد شکست دے کر قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرتا ہے ان سرکش و مستبد قوتوں کی اسطرح سے شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ خدا کے نظامِ ربوبیتِ عالمینی کا قیام، وہ آیاتِ کبریٰ ہیں۔ جن کا مشاہدہ نبی کو کرایا جاتا ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! قرآن کی روشنی میں نبی کا مقام اور یہ ہے وہ فریضۂ عظیم جسکی ادائیگی کے لئے اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ نبی کا کام خدا سے وحی پا کر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے

نبوت نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لہٰذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے قیام کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد امت کے سپرد ہوئے حضورؐ کے بعد امت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سرانجام دیا لیکن اسکے بعد بدقسمتی سے یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب امت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبویؐ میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے۔ اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لے۔

یاد رکھیئے برادران! انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے اسکی نجات و سعادت کی صرف ایک راہ ہے یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدی (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جسکی طرف پیامِ محمدی (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔ اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است۔

معراجِ نبویؐ

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ریڈیو کی تقریر جو ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سوئے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اسے دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان و یقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبرئیل نے تھپکی دے کر کہا کہ دیکھ کیا کرتا ہے۔ آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی۔ جہاں اتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبرئیلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طور سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہمکلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا۔ جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا ادھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبریلؑ نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی ادھر آؤ۔ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری نظر آئی۔ اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا کہ یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا کہ دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا کہ یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اتر گئے۔ اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے

پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں پانی۔ دوسرے میں دودھ، تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا۔ جبریلؑ نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعے سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے؟ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریلؑ نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انھیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں تب دروازہ کھلا اور آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی اُن بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آدمؑ ہیں آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسلِ آدم ہے۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سر گرانی انھیں نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا۔ مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر یہ دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا کہ یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات

کر جاتا ہے پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبان طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینہ کو نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملہ کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آگ جلانے والے ان کو روندتے ہوئے گزرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے حرام سے اپنی خواہش نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کہ کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیئے جو اُن کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی۔ جو نہایت ترشروئی سے ملا۔ آپؐ نے جبریلؑ سے پوچھا اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے۔ ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کام کیا۔ یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سنکر آپؐ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلہ سے گذر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ یحییٰؑ اور عیسیٰؑ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلہ میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ۔ پانچویں پر حضرت ہارونؑ چھٹے پر حضرت موسیٰؑ سے آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے۔ تو ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

پھر مزید ارتقاء شروع ہوا۔ یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے۔ جو پیش گاہِ رب العزت اور عالمِ خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہِ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا۔ اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہ جلال سامنے تھی۔ ہم کلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقر کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشیٔ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی انھوں نے روداد سن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جایئے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہٗ نے دس نمازیں کم کر دیں پلٹے تو حضرت موسیٰ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انھوں نے آپکی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنایئے گا۔ ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لئے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔ حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں! پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں۔ کہا قوم کو جمع کرلوں سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟ فرمایا بے شک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کرلیا۔ اور کہا لو اب کہو۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن! محال! پہلے تو شک تھا۔ اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سنکر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے کہ یہ محمدؐ کے دست راست ہیں۔ یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔ انھوں نے یہ قصہ سن کر کہا کہ اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے۔ رسول اللہؐ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں، کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتلا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گذرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتا دیا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا۔ سب سو رہے تھے۔ میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے ایسے ہی کچھ اور اتنے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

معراجِ انسانیت

از۔ پرویز

سیرت صاحب قرآن علیہ السلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔

بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ دلایتی گلیز ڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد بمعہ گرد پوش

قیمت۔ بیس روپے

رابطۂ باہمی

مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی کی مجلس مشاورت میں طے پایا کہ۔

(۱) تمام بزموں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے اپنے ہاں دارالمطالعہ قائم کریں جن میں طلوع اسلام کا قرآنی لٹریچر رکھا جائے۔ اس کے علاوہ روزانہ اخبارات بھی۔

(۲) بزموں کو تاکید کی جائے کہ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ پمفلٹوں کی تقسیم عام کی جائے اور نہایت منظم طریقے سے۔

(۳) بزموں سے گذارش کی جائے کہ وہ اپنی کارگذاری ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک بالالتزام مرکزی بزم کو بھیجا کریں۔

(۴) صدر مرکزی بزم کی تعدد ازدواج پر تقریر (بزبان انگریزی) کو پمفلٹ کی شکل میں نیز ادارہ کی طرف سے شائع شدہ پمفلٹ "روٹی کا مسئلہ" کو سندھی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جن بزموں کو ان دونوں پمفلٹوں کی یا ان میں سے کسی ایک کی ضرورت ہو وہ مرکزی بزم کو اطلاع دیں۔

(۵) تمام بزمیں اپنی اپنی جگہ مرکزی فنڈ کے لئے پوری پوری کوشش کریں تاکہ مرکزی فنڈ کمیٹی (لاہور) کے کام میں آسانی ہو جائے۔ بزموں کو یاد ہوگا کہ یہ فنڈ کنونشن کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر جمع ہو جانا چاہیئے۔

(۶) بزم طلوع اسلام پشاور کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ جملہ اراکین بزم نے ماہانہ چندہ کا بطیب خاطر تعین کر دیا ہے۔ نیز ارباب ذوق کے لئے قرآنی لٹریچر مہیا کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔

(۷) بزم طلوع اسلام لاڑکانہ کی رپورٹ یہ ہے کہ اٹھارہ جنوری کو محترم نظام الدین صاحب ایڈووکیٹ کے دولت کدہ پر بزم کی تشکیل کی گئی اور جناب احمد نواز اعوان صاحب کو ترجمان منتخب کیا گیا۔

(۸) پشاور چھاؤنی میں بزم طلوع اسلام قائم کی گئی جس کے ترجمان مسٹر بدرالدین صاحب منتخب ہوئے ان کا پتہ بدر ٹیلرنگ ہاؤس پشاور چھاؤنی ہے

(۹) کراچی میں خواتین کی تنظیم کا کام اچھے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ اتوار کے درس قرآن میں شرکت کرنے والی خواتین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بزم طلوع اسلام (خواتین) قائم ہو چکی ہے۔ بزم کی طرف سے ایک پمفلٹ بعنوان "پاکستانی عورت ــــ منزل کہاں ہے تیری" شائع کیا گیا ہے۔ دوسرے شہروں کی بزم خواتین جنہیں یہ پمفلٹ مطلوب ہو وہ مرکزی بزم طلوع اسلام کو اطلاع دیں۔ پمفلٹ بلا قیمت شائع کیا گیا ہے

(۱۰) اطلاعاً تحریر ہے کہ درس قرآن ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے محترم پرویز صاحب کے مکان پر (جہاں ادارہ کا دفتر بھی ہے) ہوتا ہے۔ کراچی شہر سے جو لیسن جیل روڈ کی طرف آتی ہیں۔ وہ جیل کے کنارے پر اسلام آباد چوک میں رکتی ہیں۔ چوک میں سامنے ادارۂ طلوع اسلام کا بورڈ لگا ہے جو درس گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ درس کے انتظامات محترم سعید صاحب نے اپنے ذمے رکھے ہیں۔ ان کے حسن انتظام کے لئے بزم اور سامعین ان کے سپاس گذار ہیں۔

۹۔ بزموں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مرکزی بزم کے ساتھ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کریں۔

سکریٹری مرکزی بزم طلوع اسلام ۱۲۵ خلیق منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی ۳

تھکانے والے کام اور تھکانے والے کھیل، بہت سی محفوظ طاقت چاہتے ہیں جو معمولی خوراک سے حاصل نہیں ہوتی ایسے شاغل والوں کو اوولٹین ضروری فاضل غذائیت بہم پہنچاتی ہے جس سے دماغ اور اعصاب تقویت پاتے ہیں۔ اگر آپ روزانہ زندگی چست اور خوش آئند طریق پر گذارنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بہترین سامان اوولٹین ہی مہیا کرتی ہے۔

طاقت اور توانائی کے حصول کے لئے خوش ذائقہ

اوولٹین استعمال کیجئے

OVALTINE

تقسیم کنندگان:- گریہم ٹریڈنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ کراچی اور چٹاگانگ

P.459

DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دُورا جلوسن
ناخون کی پالیش
تزئین حُسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دُورا جلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
امریکہ میں بنی ہوئی
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

سلسلۂ اصلاح و تذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کیمتعلق قرآن کی تعلیم

۹

[اس مضمون کی گذشتہ پانچ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ، نیز بھائی بہنوں کو آپس میں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض و واجبات کیا ہیں؛ اس کے بعد چھٹی ساتویں اور آٹھویں قسط میں یہ بتایا گیا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؛ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق و واجبات ہیں۔ لہٰذا ان کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ یہ عنوان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام]

میاں بیوی

بیوہ عورتوں کا نکاح کر دینا چاہیئے

معاشرہ میں ایسی عورتیں نہیں رہنی چاہئیں جن کے شوہر نہ ہوں۔ اگر کسی عورت کا شوہر مر گیا ہو یا اس کو اپنے شوہر سے طلاق ہو گئی ہو تو ایسی صورت میں معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ جلد از جلد ان عورتوں کا مناسب انتظام کرے اور ان کی مرضی کے مطابق ان کی شادی کر دے۔ کیونکہ معاشرہ میں ایسی بے سہارا عورتوں کا رہنا نہ صرف معاشرہ میں ناہمواریوں کا موجب بنے گا بلکہ طرح طرح کی اخلاقی بیماریوں کا سبب بھی بن جائے گا۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاۗءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲۴/۳۲)

تم میں جو عورتیں بے شوہر رہ جائیں۔ ایسے ہی نیک غلاموں اور نیک باندیوں کا نکاح کر دیا کرو

اگر وہ محتاج اور ضرورت مند ہوں تو خدا اپنے فضل سے انہیں بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعتوں والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

عِدّت لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ جونہی کسی کا شوہر مرا فوراً اس کی دوسری شادی کر دی جائے یا جونہی کسی عورت کو طلاق ملی اگلے دن ہی اس کی دوسری شادی رچا دی جائے۔ کیونکہ اس میں بھی بڑے مفاسد ہیں۔ سب سے بڑا مفسدہ تو نسبی اختلاط ہے ہو سکتا ہے کہ عورت پہلے شوہر سے حاملہ ہو اگر فوراً اس کی دوسری شادی کر دی جائے تو یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ یہ بچہ پہلے خاوند کا ہے یا دوسرے خاوند کا۔ اس کے بعد وراثت وغیرہ کے جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں لہٰذا یہ اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ بیوی حاملہ نہیں ہے۔ چنانچہ جس عورت کو طلاق ہو گئی ہو اسے بقدر تین حیض انتظار کرنا چاہیئے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ..... (۲/۲۲۸)

مطلقہ عورتیں اپنے تئیں تین حیض کے بقدر انتظار کریں۔ ان کے لئے یہ بالکل جائز نہیں کہ خدا نے ان کے رحموں میں اگر کچھ پیدا کیا ہو تو اسے چھپائیں اگر وہ خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہوں۔

لیکن جو عورتیں سن رسیدہ ہو چکی ہیں۔ اور انہیں حیض نہ آتا ہو۔ ایسے ہی وہ عورتیں جنہیں کسی بیماری یا دوسرے عذر کی وجہ سے اب تک حیض ہی نہ آیا ہو۔ انہیں تین مہینے تک انتظار کرنا چاہیئے۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ..... (۶۵/۴)

تمہاری جو بیویاں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں۔ اور اس بنا پر تمہیں شبہ رہ جائے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ ایسے ہی ان عورتوں کی بھی جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آیا ہو۔

اگر بیوی حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ..... (۶۵/۴)

اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔

جن عورتوں کے شوہر مر گئے ہوں۔ انہیں چار مہینے دس دن تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اسکے بعد وہ دوسری شادی کر سکتی ہیں

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ..... (۲/۲۳۴)

تم میں سے جو لوگ مرجائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار مہینے دس دن تک انتظار کریں۔ جب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو پھر تم پر کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ اپنے متعلق جائز پہچانے طریقہ پر کوئی فیصلہ کریں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہاں اس عورت کی عدت الگ بیان نہیں کی جس کا شوہر مرگیا ہو اور وہ حاملہ ہو۔ لیکن پچھلی آیت (۶۵) میں حاملہ عورتوں کی عدت بیان کی گئی ہے۔ اس لئے اس کے مطابق ایسی عورتوں کی عدت بھی وضع حمل ہی ہوگی جن کے شوہر فوت ہوگئے ہوں۔

عدت کے دوران میں شادی کی بات چیت نہ ہونی چاہیئے

اس دوران میں جب کہ عورتیں عدت گذار رہی ہوں لوگوں کو نہ ان سے نکاح کرنا چاہیئے اور نہ ہی نکاح کے پیغام دینے چاہئیں۔ البتہ اشارۃً کنایۃً کچھ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ (۲/۲۳۵)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم کنایۃً عورتوں کے پیغام سے متعلق کچھ کہدو یا اس ارادہ کو اپنے دل میں محفوظ رکھو۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان سے اس قسم کے تذکرے ضرور کروگے۔ تاہم تم ان سے پردے میں کوئی وعدے وغیرہ نہ کرو۔ بجز اس کے کہ جائز پہچانی بات کچھ کہدو جب تک عدت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک نکاح کی گرہ باندھنے کا ارادہ نہ کرو۔

عدت کے دوران میں نان نفقہ اور مکان

جن عورتوں کو طلاق دی جائے انھیں عدت کے دوران میں نان نفقہ کیلئے خرچ دینا شوہر کی ذمہ داری ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲/۲۴۱)

طلاق دی ہوئی عورتوں کو دستور کے مطابق خرچ دینا ہوگا۔ یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو خود کو قانونِ الٰہی سے ہم آہنگ رکھنے والے ہوں۔

ایسی عورتوں کو رہنے کے لئے جگہ بھی دینی ہوگی۔ اور ان کو وہیں رکھنا چاہیئے جہاں تم خود رہتے ہو۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل تک ان کا خرچ اٹھانا ہوگا۔ اس کے بعد اگر وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہوں تو ان کو اسکی اجرت بھی دینی چاہیئے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا

عَلَيْهِنَّ ۔ وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۝ (۶۵/۶)

جہاں تم خود رہتے ہو اپنی وسعت کے مطابق ان عورتوں کو بھی وہیں رکھو اور ان پر تنگی کرنے کے لئے انہیں ستاؤ نہیں۔ اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل ہو جانے تک ان پر خرچ کرو۔ اگر وہ بچوں کو تمہارے لئے دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت ادا کر دو۔ اور دستور کے مطابق آپس میں مشورہ سے کام کرو۔ اگر تم اس میں کچھ تنگی محسوس کرو تو بچوں کو کوئی دوسری عورت دودھ پلا دے گی۔

بلکہ شوہر کو مرتے وقت جس کے بعد وہ خود اس دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ اپنے پسماندگان کو یہ وصیت کر جانی چاہیئے کہ وہ اسکی بیوی کو کم از کم ایک سال تک گھر سے بے دخل نہ کریں۔ اور اس کا پورا خرچ برداشت کریں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۲/۲۴۰)

جو لوگ تم میں سے مرنے لگیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں اپنی بیویوں کے لئے یہ وصیت کرنی چاہیئے کہ ایک سال تک ان کو خرچ دیا جائے اور گھر سے بے دخل نہ کیا جائے۔ اگر اس عرصہ میں وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق خود کیا فیصلہ کرتی ہیں اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

خلع جہاں مرد کی طرف سے فسخ نکاح کی کارروائی شروع کی جا سکتی ہے۔ وہیں عورت کی طرف سے بھی فسخ نکاح کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں خلع اسی کو کہتے ہیں کہ بیوی اپنے مہر یا اپنے مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دے اور اس کے معاوضہ میں فسخ نکاح کا مطالبہ کرے۔ واضح رہے کہ قرآن نے اس قسم کے فسخ نکاح کے لئے خلع کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ قرآن اس کو بھی طلاق ہی کہتا ہے۔ خلع خالص فقہاء کی اصطلاح ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (۲/۲۲۹)

اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں (میاں اور بیوی) اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت فسخ نکاح کا فدیہ ادا کر دے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں۔ ان سے

آگے نہ بڑھو۔ جو لوگ اللہ کی حدود سے آگے بڑھتے ہیں تو یہی لوگ دراصل ظالم ہیں۔

آیت میں فَاِنْ خِفْتُمْ میں معاشرہ مخاطب ہے اور اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ تثنیہ غائب کا صیغہ ہے۔ یعنی اگر معاشرہ یہ محسوس کرے کہ میاں بیوی میں نباہ مشکل ہے اور فسخ نکاح کی طالب عورت ہو تو وہ اس کا معاوضہ دے کر نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔

طلاق کے باب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پہلا مرحلہ یہ تھا کہ معاملہ کو معاشرہ کے علم میں لایا جائے۔ اور وہ نصیحت۔ بائیکاٹ یا جسمانی سزا سے حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کامیابی نہ ہو تو دو ثالث مقرر کر دیئے جائیں ایک ثالث شوہر کے خاندان سے ہو اور دوسرا بیوی کے خاندان سے یہ دونوں مل کر اصطلاح حال کی کوشش کریں۔ اور اگر کامیابی نہ ہو تو طلاق کی سفارش کر دیں۔ بعینہٖ یہی مراحل خلع کی صورت میں بھی پورے کئے جائیں اور دوسرے مرحلہ میں اگر دونوں ثالث دیکھیں کہ شوہر کو تو فسخ نکاح پر اصرار نہیں ہے۔ مگر بیوی کسی طرح بھی نباہ کرنے پر راضی نہیں ہے تو وہ بیوی سے کہیں کہ وہ فسخ نکاح کا معاوضہ ادا کر دے اور پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ معاف کر کے نکاح فسخ کرا لے۔

طلاق اور خلع میں فرق

طلاق اور خلع اپنے نتیجہ کے اعتبار سے دونوں فسخ نکاح کی ہی صورتیں ہیں۔ دونوں میں اتنا ہی فرق ہے کہ طلاق کی صورت میں مرد فسخ نکاح کا طلبگار ہوتا ہے یا زیادتی اس کی طرف سے ہوتی ہے اور خلع کی صورت میں عورت فسخ نکاح کی طلبگار ہوتی ہے۔ یا ثالثوں کی نگاہ میں وہ قصوروار ثابت ہوتی ہے۔

کیا نکاح حکومت فسخ کریگی؟

یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ طلاق یا خلع کی صورت میں کیا شوہر اور بیوی کو عدالت سے مراجعت ضروری ہے اور اس کے بغیر نکاح فسخ نہیں ہو سکتا۔ یعنی شوہر اگر از خود بغیر عدالت کی اجازت کے طلاق دے دے تو وہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں اور اس سے نکاح فسخ ہو جائے گا یا نہیں؟

گذشتہ تصریحات میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے طلاق کے لئے جو دستور العمل تجویز کیا ہے اس سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ فسخ نکاح کا معاملہ میاں بیوی کا کوئی انفرادی یا نجی معاملہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس میں جو جی میں آئے کر گذریں بلکہ یہ ایسا معاملہ ہے جو قابل دست اندازیٔ معاشرہ ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کی کوششوں کے بعد بھی اگر صورت حال درست نہ ہو تو معاشرہ حالات کی درستگی کے لئے اول پہلا مرحلہ اور پھر دوسرا مرحلہ اختیار کر کے دو ثالث مقرر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فسخ نکاح ان دونوں ثالثوں کی رپورٹ کے بعد ہی عمل میں آئے گا۔ اور ان دونوں ثالثوں کو جس (AUTHORITY) نے مقرر کیا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ یا سفارش بھی اسی کو پیش کریں گے۔ اور فسخ نکاح کا فیصلہ بھی وہی (AUTHORITY) کرے گی۔ جس کو اس کی سفارش پیش کی گئی ہے لہٰذا یہ سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ نکاح کو فسخ کون کرے گا۔ شوہر کرے گا یا معاشرہ کرے گا؟ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی ہیئت اجتماعیہ ہی اس کی مجاز ہو سکتی ہے کہ وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے۔ اگر شوہر از خود بغیر اس معاشرہ کی ہیئت اجتماعیہ (عدالت) کے طلاق دیدے تو قانون ایسی طلاق کو طلاق تسلیم نہیں کرے گا۔ ایسے ہی وہ طلاقیں بھی تسلیم نہیں ہوں گی، جو

قرآن کے مقرر کردہ دستور العمل کے مطابق نہ دی گئی ہوں۔ اور معاشرہ نے مقرر کردہ دستور العمل کے مطابق دونوں مراحل پر عمل نہ کرلیا ہو یعنی جوں ہی شوہر کو غصہ آیا اور اس نے پھٹا پھٹ طلاق طلاق طلاق کی گردان دہرادی ہو تو ایسی طلاق قرآن کی نگاہ میں طلاق نہیں کہی جاسکتی لہٰذا ان کے نافذ ہونے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کی بعض آیات سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ طلاق دینا مرد کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں طلاق کی نسبت شوہر کی طرف کی گئی ہے۔ چنانچہ (۲/۲۲۹) میں فَاِنْ طَلَّقَهَا اور اس کے بعد پھر دوبارہ فان طَلَّقَهَا ہے۔ جس میں طَلَّقَ کی ضمیر شوہر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ سو اول تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ جب مرد اس قاعدہ کے مطابق جو اس باب میں مقرر کیا گیا ہے طلاق دے دے، یعنی وہ عدالت کی طرف رجوع کرے اور عدالت اسے فسخِ نکاح کی اجازت دیدے۔ لیکن اگر کوئی اس پر بھی اصرار کرے کہ نہیں مرد کا یہ انفرادی حق ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر لوگ طلاق کے معاملہ میں زیادتی کرنے لگیں تو معاشرہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اس حق کے استعمال پر پابندی عاید کردے۔ اس کو فقہاء کی اصطلاح میں حجر کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن الجزائری لکھتے ہیں۔

> اسلامی شریعت میں حجر کا داعیہ صرف ایک چیز کو قائم کرنا ہوتا ہے اور وہ نوع انسانی کی مصلحت ہے جیسا کہ شریعت کے تمام قابل احترام فیصلوں میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے تشریعی قوانین میں اس کا خصوصیت سے لحاظ رکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی انسانیت کی سعادت ہر حال میں قائم رہے چنانچہ شریعت کے عام قواعد میں اور اس کی محکم بنیادوں میں یہ چیز داخل ہے کہ اس نے لوگوں کے درمیان تعاون کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ اس نے صاحب قوت پر فرض کیا ہے کہ وہ ضعیف کی حتی المقدور مدد کرے اور بڑوں کے ذمہ یہ چیز حتمی قرار دی ہے کہ وہ ان چھوٹوں کی اعانت کریں جن کے معاملات ان کے ہاتھوں میں ہیں اور ان کے لیے پورا پورا اخلاص برتیں حتیٰ کہ ان کا کوئی ایسا موقع ضائع نہ ہوجائے جو ان کے دین یا دنیا کے لئے مفید ہو..... اس کی مصلحت پر نظر کرتے ہوئے ہی حجر کے عمل کو جائز رکھا گیا ہے جو ایک سفیہ میں متحقق ہے۔ سفیہ اسے کہتے ہیں جو خوبی کے ساتھ تصرف نہ کرسکے۔ بلکہ چھوٹے بچے اور مجنوں کی طرح سے اپنے سارے مال کو اڑادے۔ چونکہ حجر کا عمل محجور علیہ کی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے تو ضروری ہوگا کہ ایسے بیوقوف اور سفیہ پر بھی حجر قائم کیا جائے کیونکہ خود اس کی مصلحت بلکہ عام لوگوں کی مصلحت بھی اسی میں ہوتی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی کوئی پابندی عاید نہ کی گئی۔ تو وہ لوگوں سے معاملات کرے گا اور لوگوں کے اموال خراب کریگا۔ اسی وجہ سے تو حق تعالےٰ نے یہ حکم دیا ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا۔ اور بیوقوفوں کو اپنے مال جنھیں خدا نے تمہارے لئے کھڑے ہونے کا ذریعہ بنایا ہے حوالہ نہ کردیا کرو..... حنفیہ نے کہا ہے کہ سفیہ (بیوقوف) پر حجر کا قائم کردینا ہی مذہب میں

> مفتی بہ اور پسندیدہ مسلک ہے۔ سفیہ کی تعریف یہ ہے کہ سفیہ اس شخص کو کہیں گے جو اپنے مال میں درست تصرفات نہ کرتا ہو یعنی ان کو ناجائز کاموں میں یا بیکار چیزوں میں صرف کر دیتا ہو اور اس میں اسراف یا تبذیر سے کام لیتا ہو۔ اس اسراف میں سے جو موجب حجر ہو سکتا ہے۔ مال کو گویوں کو دیدینا۔ کھیل کود میں خرچ کرنا۔ زیادہ قیمت پر کبوتر خریدنے، مرغ خریدنے وغیرہ میں صرف کرنا، جوے میں اپنا مال اڑا دینا۔ ایسے ہی ان مصارف میں خرچ کرنا جو عقل اور شریعت کے اقتضاء کے خلاف ہوں۔ نیز مال کو اعمال خیر میں سے کسی کام میں خرچ کرنا۔ جیسے مدرسہ بنانا، مسجدیں تعمیر کرنا، ہسپتال بنانا وغیرہ تو ایسے آدمی کو سفیہ شمار کرکے اس پر بھی حجر عاید کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے عمل خیر کا انسان کو اسی وقت مکلف بنایا ہے جبکہ اس کی مالی حالت اسکی اجازت دیتی ہو۔۔۔۔۔۔ جیسا کہ قرض کی وجہ سے حجر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی غفلت کی بناء پر بھی حجر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ غفلت اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص مروجہ تصرفات مثل خرید و فروخت وغیرہ میں صحیح فیصلہ نہ کر سکتا ہو۔ اور وہ نقصان اٹھاجاتا ہو کیونکہ وہ خود سلیم القلب ہوتا ہے۔ اور لوگوں سے فریب کھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں میں سفاہت نہیں ہوتی۔ کیونکہ سفیہ تو اسے کہتے ہیں جو اپنے اختیار و ارادہ سے مال کو برباد کرتا ہو کیونکہ فاسد خواہشات کا اس پر غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ بد راہی اور خواہشات نفسانی کا مطیع ہو جاتا ہے۔ لیکن غافل آدمی جسے "مغفل" کہتے ہیں وہ قصداً اپنے مال کو خراب نہیں کرتا اور نہ ہی وہ خواہشات نفسانیہ کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ البتہ اسے آسانی سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ لوگ اسے مالی طور پر کافی نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ الخ
>
> (صفحہ ۳۴۷-۳۴۹-۳۶۷-۳۶۳ جلد ۲۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ معاشرہ کی ہیئت اجتماعیہ کو یہ حق حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی مصالح کے پیش نظر اس قسم کے مباحات پر پابندیاں عاید کر دے اور ان کے تصرفات کو کالعدم قرار دیدے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یہ دیکھے کہ لوگ فسخ نکاح کے حق کو صحیح طور پر استعمال نہیں کر رہے ہیں تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس حق کے استعمال پر پابندیاں عاید کر دے اور یہ قانون بنا دے کہ بغیر عدالت سے استصواب کئے کوئی شخص طلاق نہیں دے سکیگا۔ اور اگر کوئی شخص طلاق دے گا تو وہ طلاق شمار نہیں ہوگی۔ اس قسم کا حجر خود فقہاء کی تصریحات کے مطابق سفیہ، بیوقوف اور مغفل آدمیوں پر عاید کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہماری قطعی رائے ہے کہ اس حق کا (اگر وہ شوہر کا حق ہے) صحیح استعمال نہیں ہو رہا ہے بلکہ جو لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں وہ سفیہ یا مغفل سے کسی درجہ میں کم نہیں ہوتے جو ایک مرتبہ طلاق طلاق طلاق کہہ گذرتے ہیں اور بعد میں ادہر اُدہر روتے پھرتے اور مفتیوں کے دروازوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اس لئے اگر طلاق دینا شوہر کا حق ہو بھی تب بھی فقہاء کی تصریحات کے مطابق، حکومت کو اس قسم کا قانون بنا دینے کا حق حاصل ہے کہ لوگ اس حق کو بغیر عدالت

سے استصواب کے استعمال نہ کر سکیں کیونکہ بہرحال انسانی زندگی کی خوشگواری یا ناخوشگواری کی اہمیت مالی معاملات و تصرفات سے بدرجہا زیادہ ہے۔

ظہار بعض مرتبہ لوگ اپنی بیویوں کو اس قسم کے الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ میں تجھے اپنی ماں یا اپنی بہن کی جگہ سمجھتا ہوں۔ اور سمجھ لیتے ہیں کہ ایسا کہہ دینے سے ان کی بیوی ان پر حرام ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ایسی باتیں کہہ دینے سے بیوی نہ ماں بن جاتی ہے نہ بہن اور نہ ہی وہ ایسا کہہ دینے سے حرام ہو جاتی ہے۔ البتہ اس قسم کی باتیں منہ سے نکالنا نہایت ہی غلط اور ناپسندیدہ طریقہ ہے۔ یہ لوگ اپنی بیویوں سے تعلقات زناشوئی قائم کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے ان کو اس کا فدیہ (جرمانہ) ادا کرنا ہوگا کہ اس قسم کی غلط بات انہوں نے اپنے منہ سے کیوں نکالی۔ اس کا فدیہ ایک غلام کو آزاد کرنا (اور اگر معاشرہ میں غلام موجود نہ ہوں تو) مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنا اور جسے اس کی قدرت نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ عربی میں اسی قسم کی باتیں منہ سے نکالنے کو ظہار کہتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (۵۸/۲-۴)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھتے ہیں انہیں واضح رہے کہ وہ انکی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو پیدا کیا ہے۔ البتہ یہ لوگ ایک ناپسندیدہ اور غلط بات کہہ دیتے ہیں خدا معاف کرنیوالا اور سامانِ حفاظت عطا کرنیوالا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور پھر جو کچھ کہہ گذرے تھے اس سے رجوع کرتے ہیں (یعنی اس پر نادم ہوتے ہیں) تو بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کریں۔ اس سے تم کو نصیحت ہوگی (اور آئندہ ایسی غلط بات منہ سے نہ نکالو گے اور جو کچھ تم کرتے ہو۔ خدا خوب جانتا ہے جو ایک غلام آزاد نہ کر سکیں انہیں بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں اور جس میں اسکی قدرت نہ ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اسلئے کہ تمہارا ایمان اللہ اور رسول پر مکمل ہو جائے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور منکرین کیلئے دردناک عذاب ہے

ایلاء بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر اپنے دل میں یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا اور اس سے زناشوئی کے تعلقات نہیں رکھے گا۔ اس طرح اس کی بیوی غریب اُدھر میں لٹک کر رہ جاتی ہے۔ اس کا شوہر اس کو طلاق دیتا ہے اور نہ اس سے تعلقات رکھتا ہے ایسے لوگوں کیلئے قرآن نے چار مہینے کی مہلت رکھی ہے کہ وہ اس چار مہینے کے اندر اندر اپنے اس طرزِ عمل سے باز آجائیں ورنہ طلاق کی سلسلہ جنبانی شروع کریں۔ بیوی کو بہرحال اسی حالت میں اُدھر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ (۲/۲۲۶-۲۲۷)

جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلاء کر بیٹھتے ہیں۔ انہیں چار مہینے تک انتظار کی مہلت ہے اگر وہ اس سے رجوع کر لیں تو اللہ سامانِ حفاظت دینے والا اور بڑا مہربان ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مجلسِ اقبال

تیرھواں باب

میر نجات نقشبند (بابائے صحرائی) کے نصائح (مسلسل)

سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال نے میر نجات نقشبند (بابائے صحرائی) کے نام سے مسلمانانِ ہند و ستان کے لئے نصائح لکھی ہیں۔ ان میں انھوں نے شاہ شمس الدین تبریزی اور مولانا روم کی ایک حکایت بھی بیان کی ہے۔ یہ حکایت سابقہ اشاعت میں ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد علامہ اقبال (بہ لباسِ صحرائی) فرماتے ہیں۔

علمِ حق را در قفا انداختی
بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی

تو نے علمِ خداوندی (قرآن) کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ اور اس کی جگہ اپنے خود ساختہ تصورات و رسوم کو دین بنا رکھا ہے اور یہ سب کچھ محض روٹی کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ کس قدر افسوسناک ہے یہ ذہنیت اور کیسا خسارے کا ہے یہ سودا جس میں دینِ خداوندی جیسی متاعِ گراں بہا کو محض شکم پروری کے لئے بیچ ڈالا جائے! حقیقت یہ ہے کہ پیشوائیت میں ہمیشہ اور ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوا کوئی کسب و ہنر نہیں جانتے جن سے اپنی روٹی کما سکیں۔ وہ دوسروں کی کمائی پر پلتے ہیں۔ خدا کے دین میں اس کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی کمائی پر عیش اڑائے۔ اسلئے انہیں لامحالہ دینِ خداوندی کی جگہ ایسے معتقدات کو دین بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے جس میں ان کی روٹی کی گنجائش نکل آئے۔ نیز اس کے لئے انھیں ان لوگوں کے مفاد کی بھی رعایت رکھنی پڑتی ہے جن سے انھیں فتوحات اور عطیات ملتے ہیں۔ یہ ہے وہ "روٹی" جس کی خاطر یہ لوگ خدا کے دین کو بیچتے ہیں ـــــ اور کس قدر ارزاں بیچتے ہیں!

اس کے بعد علامہ اقبال قوم کی توجہ اس اہم نکتہ کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ ان کے اپنے پاس (خدا کی کتاب میں) اس قدر سامانِ زندگی موجود ہے۔ لیکن یہ اپنی راہ نمائی کے لئے دوسروں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

گرم رو در جستجوئے سرمہ
واقف از چشمِ سیاہِ خود نہ

کس قدر مقامِ تاسف و عبرت ہے کہ تو اپنی چشمِ سیاہ سے واقف نہیں اور سرمہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ قرآن تجھے ارض و سما کے رموز و اسرار سے آگاہ کر کے کائنات کو مسخر کرنے، بلکہ مادہ کی چار دیواری سے اوپر نکل جانے کے راستے بتاتا ہے۔ لیکن تیری حالت یہ ہے کہ تو اسے چھوڑ کر مغرب کی مادی تہذیب اور لادینی تعلیم کو اپنے لئے سرمۂ چشم بنانے کا آرزومند ہے۔ یاد رکھو! اس سے تمہیں زندگی کا سراغ کبھی نہیں مل سکیگا۔

آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب　　از دہانِ اژدہا کوثر طلب
سنگِ اسود از درِ بتخانہ خواہ　　نافۂ مشک از سگِ دیوانہ خواہ

تو اگر خنجر کی دھار سے آبِ حیات۔ سانپ کے منہ سے چشمۂ کوثر۔ بت خانہ کے دروازے سے حجرِ اسود اور باؤلے کتے سے مشک کا نافہ حاصل کرنا چاہے، تو ہو سکتا ہے کہ تو اپنی تلاش اور طلب میں کامیاب ہو جائے۔ یعنی اس قدر متضاد باتوں کا تو امکان ہے لیکن

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے
کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

تو اگر چاہے کہ مغرب کی مادی تہذیب سے سوزِ عشق حاصل ہو جائے اور اس خدا کی منکر شراب سے حق کا نشہ مل جائے۔ تو یہ ناممکن ہے واضح رہے کہ پہلے دو شعروں میں جن چیزوں کو ممکن الحصول کہا گیا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ فی الواقع ممکن ہیں۔ یہ محض اندازِ گفتگو اور اسلوبِ بیان ہے۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذر جانا ممکن ہے لیکن فلاں بات ممکن نہیں۔

جیسا کہ متعدد بار بتایا جا چکا ہے، اقبال نے شروع سے آخر تک تہذیبِ حاضر کی سخت مخالفت کی ہے۔ تہذیبِ حاضر سے مراد وہ علوم سائنس نہیں جن کی بنا پر اقوامِ مغرب نے تسخیرِ فطرت سے اس قدر قوت حاصل کر لی ہے۔ ان علوم کی تو اقبال بڑی تعریف کرتا ہے اور ان کے حصول کی مسلمانوں کو سخت تاکید۔ تہذیبِ مغرب سے مراد وہ فلسفۂ زندگی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ انسانی زندگی محض اسکی جسمانی اور طبعی زندگی ہے جس کے ختم ہو جانے سے انسان ختم ہو جاتا ہے۔ زندگی اس سے آگے نہیں چلتی۔ نہ ہی یہاں خدا کا قانونِ مکافات جاری و ساری ہے جس کی رو سے ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ اور نہ ہی انسان کو عقل سے ماوراء (وحی کی) راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ یکسر قرآن کے خلاف اور اسلام کی نقیض ہے۔ اس لئے (اقبال کے لئے) اس کی مخالفت نہایت ضروری تھی۔ اقبال کا پیام، اس تہذیبِ باطل کے خلاف مسلسل جہاد ہے۔ اس باب میں اقبال جو کچھ کہتا ہے۔ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کے مطابق کہتا ہے۔ محض سنی سنائی بات نہیں کرتا۔ اس نے مغرب کی تہذیب اور فلسفہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اس میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ خود وہاں جا کر اس تہذیب کے مآل و عواقب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اسکے بعد علیٰ وجہ البصیرت اسکے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام
رازدانِ دانشِ نو بودہ ام

میں ایک مدت تک تلاشِ حقیقت میں سرگرمِ جستجو رہا اور تہذیبِ عصرِ حاضر کے رازہائے درون پردہ تک سے واقفیت حاصل کی۔

باغبانان امتحانم کردہ اند
محرمِ ایں گلستانم کردہ اند

ان رموز و اسرار سے میری آگہی بھی بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ ہے۔ میں نے اس کے باغ کے باغبانوں (اساتذۂ مغرب) سے تعلیم حاصل کی اور انھوں نے میرے امتحان لے کر اس کی سند دی کہ واقعی میں ان کے فلسفۂ زندگی پر گہری نگاہ رکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ

گلستانے لالہ زارِ عبرتے
چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے

یہ گلستان نہیں، عبرت و موعظت کا لالہ زار ہے۔ اس کے پھول حقیقی نہیں، کاغذ کے ہیں جن میں خوشبو کی بجائے فریبِ خوشبو ہے اسی حقیقت کو انھوں نے بانگِ درا میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وائے نادانی! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
اس فریبِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

دوسری جگہ ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اس کے بعد اقبال کہتا ہے کہ

تا زبندِ ایں گلستاں رستہ ام
آشیاں بر شاخِ طوبیٰ بستہ ام

اس غرض سے کہ میں اس گلستاں سے آزاد ہو جاؤں، میں نے اپنا آشیاں شاخِ طوبیٰ پر بنا لیا۔ یعنی اس فریبِ رنگ و بو سے وہی شخص نکل سکتا ہے جو اپنا مسلک وحی کی راہ نمائی میں متعین کرے۔ اب میں اس شاخِ طوبیٰ کی بلندیوں سے علیٰ وجہ البصیرت پکار کر کہہ سکتا ہوں کہ

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است

عصر حاضر کا علم و فلسفہ حقیقت کو بے نقاب نہیں کرتا بلکہ اس کے راستے میں خود ایک بہت بڑا پردہ بنکر حائل ہو جاتا ہے۔ نظام افرنگ بت تراشتا ہے۔ بت پوجتا ہے اور ان بتوں کو اپنے تبکدوں کے اندر ہی نہیں رکھتا بلکہ دور دور کی اقوام و ممالک کے ہاتھوں ان بتوں کو فروخت بھی کرتا ہے۔ یورپ ان باطل افکار کا سرچشمہ ہے۔ انہی بنیادوں پر اس نے اپنی تہذیب و تمدن اور سیاست و معیشت کی عمارت اٹھائی ہے اور اسی کو وہ دنیا کی دیگر اقوام میں بھی رائج کرتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ساری دنیا حق سے منحرف ہو کر باطل کی پرستار بن رہی ہے۔

پابزندانِ مظاہر بستۂ
از حدودِ حس بروں ناجستۂ

اس فلسفہ کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا بس یہی عالم محسوساتِ (یا عالم شہود) ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور علم وہی ہے جسے ہم حواس (Sense Perception) کے ذریعے حاصل کر سکیں۔ دی کا وجود ناممکنات میں سے ہے۔ یہ تہذیب مادہ کی چار دیواری سے باہر جا ہی نہیں جا سکتی۔ اسکی نگاہ اس محبسِ آب و گل سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔

در صراطِ زندگی از پا فتاد
بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد

یہ تہذیب زندگی کے راستے میں بری طرح لڑکھڑا کر گری ہے۔ یہ چند قدم بھی آگے نہیں چل سکی۔ اور اپنے ہاتھوں سے آپ ہی اپنا گلا کاٹ رہی ہے۔ اس نے سیاست و معاشرت کے جو تصورات وضع کئے تھے وہی اس کی موت کا باعث بن رہے ہیں۔ بانگ درا میں ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

یہ تہذیب ابھی کل وجود میں آئی ہے۔ اور اُن تمام قوتوں اور سطوتوں کے باوجود جو اقوامِ مغرب کو حاصل ہیں، وہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے صنم سے بھاگ کر کسی اور تصورِ حیات کی تلاش میں مارے مارے پھر رہی ہیں۔ اس تہذیب کی کیفیت یہ ہے کہ

آتشے دارد مثالِ لالۂ سرد
شعلۂ دارد مثالِ ژالۂ سرد

اس کی آگ میں زندگی کی حرارت نہیں۔ موت کی برودت ہے۔ اس کا شعلہ اولے کی طرح یخ بستہ ہے۔

فطرتش از سوزِ عشق آزاد ماند
در جہانِ جستجو ناشاد ماند

اس کی فطرت سوزِ عشق (ایمان) سے بے گانہ رہی۔ اس لئے یہ اقوام دنیائے جستجو میں اس قدر ناخوش اور پریشان ہیں۔ اقبال نے

امت مُسلمہ کے متعلق ایک جگہ کہا ہے

پر در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

وہ کائنات کی پہنائیوں میں آزادانہ بال کشا ہوتی ہے اور اس کی تگ و تاز اور تلاش و تجسس میں کوئی اور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس پرواز میں اس کی نگاہ ہمیشہ "شاخِ آشیاں" پر رہتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کے نقطۂ ماسکہ (وحی۔ توحید) اور اپنے مرکز ملت کو ایک ثانیہ کے لئے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اقبال نے ان دو مصرعوں میں اسلام اور مسلمان کی زندگی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کر دیا ہے۔ مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ وہ غیر متبدل قوانینِ خداوندی (مستقل اقدارِ حیات) کا پابند ہے اور ان حدود کے اندر زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاملات کا حل خود دریافت کرتا جائے۔ جو قوم مستقل اقدار کی پابند نہیں رہتی۔ وہ جہانِ فکر و عمل میں (اقوامِ یورپ کی طرح) یکسر آوارہ ہو جاتی ہے۔ اور جو قوم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے احوال و کوائف میں تبدیلی نہیں کرتی وہ (مسلمانوں کی طرح) پابندِ قفس پرندے کی طرح نشو و نما سے محروم رہ جاتی ہے۔ حقیقی زندگی ثبات و تغیر (Permanence and Change) کے صحیح امتزاج میں ہے۔ مغرب نے اپنے آپ کو سوزِ عشق (وحی) کی بندش سے بھی آزاد کر لیا تو اپنی دنیائے تگ و تاز میں پریشان و ناشاد ہو گیا۔ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اپنے خود ساختہ رسوم و تصورات میں جکڑ لیا تو شاہراہِ حیات پر دو قدم چلنے کے بھی قابل نہ رہے۔ یورپ کی زبوں حالی اور پریشان خیالی بہر حال اس لئے ہے کہ اس نے وحی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ حالانکہ

عشق افلاطونِ علت ہائے عقل
بہ شود از نشترش سودائے عقل

عقل کی پیدا کردہ تمام بیماریوں کے لئے طبیبِ حاذق "وحی" ہے۔ یہی وہ نشتر ہے جس سے عقل کے جنون (سرسام) کا علاج ہوتا ہے۔ عقل ہر فرد اور ہر قوم کو اس کے اپنے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے۔ اس سے مختلف افراد اور اقوام کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests) پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ عالمگیر فساد ہے۔ اس کے برعکس وحی، تمام افرادِ انسانیہ کے مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے اس لئے یہ عقل کی پیدا کردہ بیماریوں کا علاج ہے۔

جملہ عالم ساجد و مسجودِ عشق
سومناتِ عقل را محمودِ عشق

تمام کائنات وحی کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے یسجد للہ ما فی السمٰوٰت والارض۔ عقل کا بت کدہ وحی کے ہاتھوں مسمار ہوتا ہے۔ یہی اسے توحید کا مرکز بناتا ہے

اے مئے دیرینہ در میناش نیست
شورِ یا رب قسمتِ شبہاش نیست

تہذیب مغرب کی صراحی میں وحی کی شراب کہن نہیں۔ اس لئے اس میں تلخی ہی تلخی ہے۔ کیف باری نہیں۔ اس کی راتیں، نعرہ "یارب" سے خالی ہیں۔ اسی لئے ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔ سپیدۂ سحر نہیں۔

لیکن مغرب کی تو یہ حالت اس لئے ہوئی کہ اس کے پاس وحیٔ خداوندی اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی۔ اقبال مسلمان سے پوچھتا ہے کہ تجھے کیا ہو گیا کہ تو اس قدر متاعِ گراں بہا کا مالک اور وارث ہونے کے باوجود انہی کے پیچھے پیچھے چلنے لگ گیا۔

قیمتِ شمشادِ خود نشناختی
سروِ دیگر را بلند انداختی

تو نے اپنے سرو کی قیمت کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ اس لئے تیری نگاہ میں دوسروں کے سرو بہت بلند قامت دکھائی دیتے ہیں۔

مثلِ نے خود از خودی کردی تہی
بر نوائے دیگراں دل می نہی

تو نے نئے (بنسری) کی طرح اپنے آپ کو اپنی ذات (خودی) سے خالی کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تو دوسروں کی لے پر فریفتہ ہے۔

اے گدائے ریزۂ از خوانِ غیر
جنسِ خود می جوئی از دکانِ غیر

تو دوسروں کے دسترخوان کی ریزہ چینی کرتا ہے تو اپنی جنس کو غیروں کی دکانوں سے تلاش کرتا ہے۔ کس قدر غیرت سوز اور حماقت انگیز ہے تیری یہ روش!

بزمِ مسلم از چراغِ غیر سوخت
مسجدِ او از شرارِ دیر سوخت

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنی محفلوں کو غیروں کے چراغوں سے روشن کیا تو ان چراغوں نے روشنی دینے کی بجائے ان کی محفلوں میں آگ لگا دی۔ بت کدوں اور خانقاہوں سے وہ چنگاریاں اٹھیں جن سے ان کی مساجد جل کر راکھ ہو گئیں۔ جب تک ان کا دین، غیروں کے تصورات سے منزہ اور پاک تھا، ان کی مزرعِ ہستی سرسبز و شاداب تھی۔ جب انھوں نے دوسروں کے معتقدات اور نظریات اپنے دین میں داخل کر لئے تو ان کا اپنا زرخالص مٹی میں مل گیا۔

از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید
ناوکِ صیاد پہلویش درید

ہرن جب تک کعبہ کے احاطہ میں رہے، کوئی شکاری اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا (قرآن کی رو سے حریم کعبہ میں شکار

کی اجازت نہیں وہاں جو بھی داخل ہو جائے اسے امن نصیب ہو جاتا ہے) لیکن جب اس نے کعبہ کی پناہ چھوڑ دی تو وہ ہر شکاری کے تیر کا نشانہ بن گیا۔ جب تک مسلمان نظام خداوندی کے دامن تلے تھا دنیا جہاں کے مصائب دنوائب سے مصئون و مامون تھا جب وہ دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو باطل کی ہر قوت اس پر جھپٹ پڑی۔

شد پریشاں برگِ گل چوں بوئے خویش
اے زخود رم کردہ۔ باز آ سوئے خویش

پھول کی خوشبو کو تو پھیلنا چاہیئے تھا چنانچہ وہ پھیلی۔ ساری دنیا میں منتشر ہوئی۔ لیکن جب اس کے ساتھ پھول کی پتیاں بھی ہوا سے منتشر ہو گئیں تو پھول کی ہستی ختم ہو گئی۔ جب ملت اسلامیہ کے افراد اپنے مرکز سے الگ ہو کر منتشر ہو گئے تو ان کی ملی ہستی برباد ہو گئی۔ یہ اپنے آپ سے بھی گئے۔

اب اس کا علاج کیا ہے؟ یہی کہ یہ پھر اپنے مرکز سے وابستہ ہو جائیں۔

اے امینِ حکمتِ اُم الکتاب
وحدتِ گم گشتۂ خود باز یاب

تو حکمتِ قرآنی کا امین ہے۔ تجھے چاہیئے کہ اپنی اُس وحدت کو جسے تو گم کر چکا ہے۔ پھر سے دریافت کرلے۔ جب تک تم میں پھر سے مرکزیت پیدا نہیں ہوگی، نہ حکمتِ قرآنی دنیا میں ایک موثر قوت بن سکے گی۔ نہ اس کی حامل قوم کسی وقار کی مستحق ہوگی۔

ما کہ دربانِ حصارِ ملتیم
کافر از ترکِ شعارِ ملتیم

ہم، جو کہ حصارِ ملت اسلامیہ کے دربان ہیں، جن کا فریضۂ حیات، ملت کے قلعہ کی چوکیداری ہے۔ ہم ملت کے شعار کو ترک کر کے کافر ہو چکے ہیں۔ ہمارا اسلام، فقط نام کا اسلام رہ گیا ہے۔ اسلام ایک اجتماعی نظام کا نام تھا۔ اب یہ صرف انفرادی عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے۔

ساقیٔ دیرینہ را ساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی برشکست

ہمارے پرانے ساقی کا ساغر ٹوٹ چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میکدۂ حجاز کے رندوں کی محفل ہی اجڑ گئی ہے۔ جب اسلام نے اپنی جامعیت کھو دی تو ملت، فرد فرد ہو گئی۔

کعبہ آباد است از اصنامِ ما
خندہ زن کفر است بر اسلامِ ما

کعبہ اُس وقت تک کعبہ تھا جب تک وہ ہمارے نظام کا ذی قوت مرکز تھا۔ جب ہماری مرکزیت ہی ختم ہو گئی تو ہم نے انفرادی

مفاد کے بتوں کی پرستش شروع کردی۔ اب وہی کعبہ ہمارے ان اصنام کی وجہ سے بت کدہ بن گیا۔ اب ہمارا اسلام اس قسم کا ہو گیا جس پر کفر بھی ہنستا ہے۔

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتۂ تسبیح از زنار ساخت

ہمارے مذہبی پیشواؤں نے غیروں کی محبت کے قمار خانے میں خود اسلام کی بازی لگا دی اور یوں اسے نذر بتاں کر دیا انہوں نے اپنی تسبیح کے دانوں کو زنار کے تاگے میں پرو لیا۔ یعنی اسلام تو ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اب ان کی وجہ جامعیت کفر کے تصورات و شعائر ہیں۔ کہیں یہ وطنیت کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں، کہیں نسل کی وحدت سے۔ ان وجوہ جامعیت کو بس یوں سمجھئے جیسے تسبیح کے منتشر دانے زنار کے تاگے میں پرو لئے گئے ہوں۔

یہ ہے ہمارے ارباب شریعت کی حالت۔ باقی رہے خداوندان طریقت (صوفی) سو ان کی کیفیت یہ ہے کہ

پیر ہا پیر از بیاض مو شدند
سخرہ بہر کودکان کو شدند

وہ محض لمبے لمبے سفید بال بڑھا کر پیر بن جاتے ہیں۔ ان میں اس سے زیادہ کوئی صلاحیت Qualification ہی نہیں ہوتی۔ نہ دل میں سیرت کا نور۔ نہ دماغ میں عقل۔ نتیجہ اس کا یہ کہ گلی محلے کے لڑکے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

دل ز نقش لا الٰہ بیگانۂ
از صنم ہائے ہوس بت خانۂ

ان کا دل لا الٰہ کے نقش سے کورا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس سے مفہوم کیا ہے؟ اور ایک مومن کس طرح تمام دنیا کی قوتوں کو ٹھکرا کر ایک خدا کے قانون کا مطیع و فرمانبردار بنتا ہے۔ ان کا دل خدائے لاشریک کے تصور سے تو خالی ہوتا ہے لیکن اپنی حرص و ہوس کے بتوں سے اچھا خاصا صنم خانہ بن جاتا ہے۔

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش
آہ زیں سوداگران دیں فروش

بال بڑھائے۔ گدڑی پہنی۔ اور پیر بن گئے۔ اور پھر اس بھیس میں دین فروشی شروع کر دی۔ یہ ہیں ہمارے یاران طریقت اور مرشدان راہ حقیقت!

با مریداں روز و شب اندر سفر
از ضرورت ہائے ملت بے خبر

اپنے مریدوں کے انبوہ کو ساتھ لیا اور دورے پر چڑھ نکلے۔ دعوتیں اڑائیں۔ ضیافتیں کھائیں۔ نذرانے وصول کئے۔ موٹے تازے

ہوکر گھر واپس آگئے۔ ان کی جانے بلا کہ ملت پر کیا گذر رہی ہے اور اس کی ضروریات کیا ہیں۔؟

دیدہ ہا بے نور مثلِ نرگس اند
سینہ ہا از دولتِ دل مفلس اند

ان کی آنکھیں دیکھئے تو بڑی بڑی ہیں لیکن نرگس کی طرح بالکل بے نور۔ ان میں نور بصیرت کہیں نام کو نہیں۔ اور ان کے سینے دل کی دولت سے بالکل تہی۔

واعظاں ہم صوفیاں منصب پرست
اعتبارِ ملتِ بیضا شکست

مختصراً یہ کہ چاہئے واعظ ہوں یا صوفی۔ سب کے سب جاہ و منصب کے بھوکے اور حکومت کے دروازے کے بھکاری ہیں۔ ان کی وجہ سے غیروں کی نظروں میں پوری کی پوری ملت ذلیل و خوار ہوگئی ہے۔ اس کا کوئی وقار اور اعتبار ہی نہیں رہا۔

واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت
مفتیٔ دینِ مبیں فتوٰے فروخت

واعظ کی یہ حالت کہ اس کی آنکھیں بت خانہ کے دروازے پر گڑی ہوئی ہیں۔ وہی اس کی تمام امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اور مفتیانِ دینِ متین کا یہ عالم ہے کہ وہ چند ٹکوں کے عوض فتوے بیچتے اور جہاد کو حرام قرار دیتے ہیں۔

چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما
رخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

جب ہمارے اربابِ شریعت اور یارانِ طریقت کا یہ حال ہو کہ ان کی آنکھیں بت کدوں اور میخانوں پر لگی ہوئی ہوں تو آپ خود ہی سوچئے کہ پھر ملت بچاری کا کیا حال ہوگا۔؟

یہ آخری شعر حافظؔ کے اس شعر سے ملخص ہے کہ

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اس پر اس باب کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اقبال اور قرآن (از:- پرویز)　　۲۵۶ صفحات :-　　قیمت :- دو روپے

حقائق و عبر

۱۔ دیانتدار افسر

ہمارے معاشرہ میں بددیانتی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اب اسے زندگی کا معمول سمجھ لیا گیا ہے۔ اب شاید ہی کوئی ایسا کام ہو جو رشوت کے بغیر آسانی سے ہو سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر کسی جگہ کوئی دیانتدار افسر آجائے تو وہ لوگوں کے لئے آیۂ رحمت ہوگا۔ لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ ایسا افسر اور بھی باعثِ زحمت بن جاتا ہے سب سے پہلے تو یہ کہ چونکہ وہ سمجھتا ہے (اور بجا طور پر سمجھتا ہے) کہ اسکے دوسرے ہم منصب بددیانت ہیں۔ اور وہ اس خصوصیت (دیانتداری) میں منفرد ہے۔ اس لئے اس سے اس کے دماغ میں عجیب قسم کا تکبر اور رعونت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رکھا ہی نہیں بلکہ بدمزاج ہو جاتا ہے اور اپنی بدمزاجی پر ناز کرتا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ دوسرے افسر تو اس لئے نرم طبیعت اور ملنسار ہیں کہ انہیں لوگوں سے اپنے مفاد حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ میں نے کونسی رشوت لینی ہے جو ان سے خوش خلقی سے پیش آؤں۔ لوگ مجھے بدمزاج اور کج خلق سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں۔ مجھے ان کی کیا پرواہ ہے؟ یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے کہ لوگ مجھے بدمزاج سمجھ کر مجھ سے دور دور رہیں۔ وہ یہ قطعاً بھول جاتا ہے کہ بدمزاجی ایک بنیادی عیب ہے جس کا ازالہ دیانتداری نہیں کر سکتی۔

پھر چونکہ ہمارے معاشرے میں قانون شکنی اور جرائم پیشگی عام ہو رہی ہے، اس لئے دیانتدار افسر کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص اسکے سامنے آئے وہ اُسے مجرم تصور کرتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک دنیا میں شریف انسان صرف وہی ایک ہوتا ہے۔ باقی سب بدمعاش ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس شخص کا بھی اس سے معاملہ پڑے وہ اُس سے اُس قسم کا برتاؤ کرتا ہے۔ جس قسم کا برتاؤ تھانیدار شہر کے غنڈوں سے کرتا ہے۔ حالانکہ قانون اور عدل کا یہ اولین تقاضہ ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اُسے مجرم نہ سمجھا جائے اور آگے بڑھیے۔ ایسا افسر جس شخص کو مجرم قرار دیتا ہے، اس کا جرم کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو، اسے سخت سے سخت سزا دیتا ہے۔ اور دل میں خوش ہوتا ہے کہ میں قانون شکنوں کی ہڈیاں توڑ رہا ہوں۔ حالانکہ سزا با اندازہ جرم، عدل و دیانت کا بنیادی اصول ہے۔ ویسے بھی، جرم کی نوعیت کے علاوہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ مجرم عادی قانون شکن ہے یا اس سے اتفاقیہ ایسا کچھ ہو گیا ہے لیکن دیانتدار افسر کی نظروں میں اس سے کچھ فرق نہیں ہوتا۔ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے اور سخت ترین لاٹھی سے۔

ہمارے نظم و نسق کی مشینری کا یہ حال ہو چکا ہے کہ کسی معاملہ زیر تحقیق و تفتیش کے متعلق صحیح صحیح حالات کا سامنے آنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ اور چونکہ افسران بالا کو بہرحال ماتحت کارندوں کی رپورٹوں پر انحصار کرنا ہوتا ہے اس لئے کسی معاملہ میں صحیح فیصلہ

کا صادر ہو جانا اور بھی مشکل ہو گیا ہے ان حالات میں اگر کوئی ایسا ذریعہ ہو جس سے افسر متعلقہ تک صحیح صحیح حالات پہنچ سکیں تو اسے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ لیکن دیانتدار افسر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر کسی معاملے کے متعلق کوئی ایسا شخص جس پر اسے ویسے بڑا اعتماد ہو کوئی صحیح اطلاعات بہم پہنچائے تو اسے یہ سفارش پر محمول کر لیتا ہے۔ اور ملزم بچائے کے اور بھی زیادہ خلاف ہو جاتا ہے حالانکہ اسے سمجھنا چاہیئے کہ مجرم کی سفارش اور چیز ہوتی ہے اور کسی کا کسی افسر کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا اور چیز اسے چاہیئے یہ کہ (بجائے اسکے کہ اس کا الٹا اثر لے) خود تحقیق کر کے دیکھے کہ جن واقعات سے اسے مطلع کیا گیا ہے وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ یہ چیز صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں ممد و معاون ہو گی۔ لیکن دیانتدار افسر اس کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھتا۔

غرضیکہ اس قسم کی ذہنیت اور حرکات سے یہ دیانتدار افسر لوگوں کے لئے ہوا بن جاتا ہے اور اس میں وہ فخر محسوس کرتا ہے کہ لوگ میری دیانت داری سے بہت ڈرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اسکے ماتحت عملہ کو بالکل چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔ نیچے یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور افسر صاحب اپنی دیانت داری کے نشے میں مگن یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم نے ڈنڈے کے زور سے حالات بالکل بدل دیئے ہیں۔

اس طرح یہ دیانت دار افسر لوگوں کے لئے سایۂ رحمت ہونے کی بجائے موجب ہزار زحمت بن جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ اس سے اس قدر تنگ آجاتے ہیں کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس سے تو رشوت خوار افسر ہزار درجہ اچھا تھا۔ اُس کے زمانے میں (کچھ دے دلا کر ہی سہی) کام تو ہو جاتا تھا۔

ہمارے ان دیانتدار افسروں کو کون سمجھائے کہ دیانتداری بہت اچھی چیز ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ دیانتدار بن کر اپنے آپ کو انسانیت کی تمام دوسری خصوصیات سے مستغنی سمجھ لیں۔ دیانتداری بھی اسی صورت میں اچھے نتائج پیدا کر سکتی ہے جب یہ دیگر صفاتِ انسانیہ کے ساتھ مل کر عمل پیرا ہو۔ آپ محض اپنی دیانتداری کو تمام دوسری صفات کا قائم مقام سمجھ کر خوش نہ ہو لیں۔ انسانی معاشرہ میں حسن و توازن کے لئے تمام صفات کے امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے جو دیانتداری دوسری طرف سے آنکھیں بند کر لے۔ سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ محض ایک عادت ہے یا کمزوری۔ اور یا نیک نامی کی شہرت حاصل کرنے کا آسان ذریعہ۔ بہرحال، اس سے معاشرہ کو فائدے کی بجائے الٹا نقصان پہنچتا ہے۔

۲۔ حریت اور آزادی کے علمبردار!

پچھلے دنوں سعودی عرب کے بادشاہ سعود نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> انسانیت جن مصیبتوں کا شکار اور پریشانیوں میں مبتلا ہے اس کی وجہ وہ غلبہ و استیلا ہے جو قوت کے بل پر قائم رکھا جاتا ہے۔ قوت کے بل پر حکومت کرنا اب عہدِ پارینہ کی داستان اور ایک شجرِ بے ثمر قرار پا چکا ہے۔ ہمیں اس اصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں ہر انسان کو حریت

> اور آزادی کا حق حاصل ہے۔ دنیا کو جنگ کی تباہیوں سے محفوظ رکھنے کا یہی ایک طریق ہے ...... ہمیں امید ہے کہ مجلس اقوام متحدہ ہر ممکن کوشش کرے گی کہ اس کا چارٹر زندہ اور فعال رہے تاکہ وہ عدل و انصاف اور احترامِ آدمیت کے بلند اصولوں کو قائم رکھ سکے۔
>
> (ڈان ۳۱ر جنوری ۱۹۵۷ء)

آپ ذرا تصور کو کام میں لایئے اور دیکھیے کہ جب شاہ سعود صاحب یہ کلمات طیبہ ارشاد فرما رہے ہوں گے، تو دنیا کی جمہوریت پسند قوموں کے نمائندے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنس رہے ہوں گے اور دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ اللہ کی شان ہے کہ حریت، آزادی اور احترامِ آدمیت کے اصولوں کا وعظ وہ حضرت فرما رہے ہیں جو اس بیسویں صدی میں ملوکیت کے علمبردار ہیں اور جن کی مملکت میں غلام اور لونڈیاں سربازار نیلام ہوتی ہیں۔

اخبار میں جہاں مندرجہ صدر خبر شائع ہوئی ہے۔ اس کے نیچے یہ خبر بھی درج ہے کہ

> شاہ سعود صاحب جس جہاز سے امریکہ تشریف لائے۔ انہوں نے اسکے ملازمین میں بیس ہزار ڈالر بطور انعام تقسیم کئے۔ نقد انعام کے علاوہ ہر شخص کو سونے کی گھڑی بھی عطا فرمائی گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جہاز کے تمام مسافروں کو (جن کی تعداد ستر کے قریب تھی) خاص دعوت بھی کھلائی۔ سفر کے دوران میں ان کے کمرے میں تخت بچھا دیا گیا تھا۔ اور ایک ایسا مقناطیس نصب کر دیا گیا تھا جس سے قبلہ کا رخ ہر وقت معلوم ہو سکتا تھا۔

اس کے دوسرے روز بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ

> شاہ سعود کے لئے دس لاکھ ڈالر کے خرچ سے ساٹھ موٹر کاروں کا ایک خاص کارواں تیار ہو رہا ہے۔ ان میں بعض موٹروں میں ایسے شیشے لگائے جائیں گے۔ جن سے موٹر کے اندر بیٹھنے والا باہر کی چیزوں کو دیکھ سکے گا۔ لیکن باہر والا اندر کچھ نہیں دیکھ سکے گا۔ (ڈان ۲/۲/۵۷)

یہ اُن ملک کے فرمانرواؤں کے اسراف کا عالم ہے جس میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر نہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کی عملی زندگی اور اس پر وعظ کہتے ہیں۔ حریت، مساوات اور احترامِ آدمیت کے!

---x---

۳۔ ہمارے مہمان

جب سے پاکستان بنا ہے، بیرونی ممالک کے مہمانوں کا تانتا بندھا چلا آ رہا ہے۔ آج افغانستان کے وزیر اعظم آ رہے ہیں تو کل حجاز کے سلطان۔ پرسوں شام کے صدر تشریف لائے تھے۔ اور اس سے اگلے دن چین کے وزیر اعظم۔ جب کسی نئے مہمان کی آمد آمد ہوتی ہے تو سارے ملک میں شور مچا دیا جاتا ہے کہ پاکستان کا ایک نہایت مخلص دوست آ رہا ہے، اس لئے تمام افراد مملکت کو چاہیئے کہ وہ اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کریں۔ آنے والے کا استقبال

شاہانہ کروفر سے کیا جاتا ہے۔ لاکھوں روپے زیبائشوں اور آسائشوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جاتے وقت بیش بہا تحفے بطور یادگار ساتھ کئے جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے اڈے پر آنسو بھری آنکھوں سے انہیں الوداع کہا جاتا ہے۔

ادھر ابھی ان کا جہاز دوسرے ملک کی سرزمین کو بھی چھونے نہیں پاتا کہ اس 'مخلص دوست' کی طرف سے پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود، پھر ایک نئے آنے والے کے لئے اُسی طرح دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے ہیں جس طرح اس جانے والے کے لئے کیا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مہمان نوازی تقاضائے انسانیت ہے۔ لیکن دوست دشمن کی تمیز تقاضائے زندگی ہے۔ سانپوں کو دودھ پلانا کون سے ضابطۂ اخلاق دستمن کی رُو سے جائز قرار پا سکتا ہے؟ ہمارا ملک بڑا غریب ہے۔ اوّل تو ہمیں اس قسم کی مہمان نوازی پر خرچ ہی کم از کم کرنا چاہیئے۔ اور جو کچھ بھی خرچ کیا جائے صرف ان کے لئے کرنا چاہیئے جو فی الحقیقت پاکستان کے دوست اور بہی خواہ ہوں۔ ورنہ سعدی تو بہت پہلے سے کہہ گیا ہے کہ

نکوئی با بداں کردن چناں است کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

۴۔ ماسکو اور بھارت

تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد (۱۹۴۸ء) سے ہمارے ارباب حل و عقد نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ملک میں پاکستان دشمن عنصر اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہے اور اس کا استیصال نہایت ضروری ہے۔ ہم نے واضح الفاظ میں کہا کہ یہ نہایت ضروری ہے کہ اس عنصر کی کھلے کھلے طور پر نشاندہی کی جائے تاکہ لوگ ان سے محتاط رہیں اور پھر اس عنصر کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جائے۔ لیکن نہ تو کسی نے واضح طور پر اس عنصر کی نشان دہی کی اور نہ ہی ایسے لوگوں کے خلاف کسی تادیبی کارروائی کا سنا گیا۔ بایں ہمہ اس اعلان کو بار بار دہرایا گیا کہ ملک میں تخریبی عنصر اپنی غداریوں سے باز نہیں آتا۔ اس عنصر کو ڈھیل دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کارروائیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ اور اب انھوں نے وہ کچھ کھلے بندوں کہنا شروع کر دیا ہے جسے وہ ابتداءً پردوں کے پیچھے چھپ کر کہا کرتے تھے اس کی تازہ مثال بھاشانی صاحب کی وہ حرکت ہے جو انھوں نے پچھلے دنوں کاگمار ی میں کی ہے۔ ان کی اس کارروائی کی جو تفاصیل اخبارات میں آئی ہیں۔ ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بھاشانی صاحب کا منہ ماسکو کی طرف ہے اور ہاتھ بھارت کی طرف۔ وہ ملک میں کمیونزم پھیلانا چاہتے ہیں اور پاکستان سے الگ ہو کر بھارت کے ساتھ ملنے کے متمنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان میں ان دو جرائم سے بڑھ کر کوئی اور جرم بھی سنگین ہو سکتا ہے؟ کیا کسی شخص کی غداری کے لئے اس سے بڑھ کر کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک اسلامی مملکت میں کمیونزم جیسے خلافِ اسلام نظریات کی ترویج کے لئے کوشاں ہو اور علی الاعلان کہے کہ (اگر حالات ایسے ہی رہے جیسے وہ بزعمِ خویش سمجھ رہا ہے) تو وہ اپنا رشتہ بھارت کے ساتھ جوڑے گا۔

پھر لطف یہ ہے کہ بھاشانی صاحب نے یہ کچھ اپنی کسی نجی گفتگو میں نہیں کہا بلکہ اس کانفرنس میں کہا۔ جس میں ملک کے بڑے بڑے ذمہ دار ارباب حل وعقد موجود تھے۔ اطلاع یہ ہے کہ وہاں انھوں نے لینن گیٹ۔ سبھاش گیٹ اور گاندھی گیٹ بنائے اور اس قسم کے پنڈال میں اس کانفرنس کا اجتماع ہوا۔ ہم ملک کے ان ذمہ دار حضرات سے جو اس کانفرنس میں شریک تھے پوچھتے ہیں کہ کیا انھوں نے ان دروازوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر دیکھا تھا تو کیا انھیں ان کے سائے تلے کسی تخریبی عنصر کا پتہ نشان نہیں مل رہا تھا؟ کیا ان میں سے کسی میں بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ان دروازوں کو توڑ کر بھاشانی صاحب کو بتاتا کہ وہ کس ملک میں بستے ہیں اور کیا کچھ کر رہے ہیں؟ اگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی تو کیا اس کی بھی ہمت نہ تھی کہ کم از کم ایسی کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیتا۔ جس میں ان دروازوں میں سے گذر کر جانا پڑتا تھا! خدا ہی جانے اس ملک کا کیا بنے گا جس میں اس قسم کی حرکتیں کھلے بندوں ہوں اور ان کے خلاف کوئی قدم بھی نہ اٹھے!

بھاشانی صاحب نے یہ بھی کہا ہے (اور اس قسم کی آوازیں مشرقی بنگال سے اکثر و بیشتر سنائی دیتی رہتی ہیں) کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو لوٹ کھسوٹ رہا ہے۔ حیرت ہے کہ ارباب حکومت یہ سب کچھ سنتے ہیں اور اس کے جواب میں ایک لفظ تک بھی ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔ بات بالکل صاف ہے کہ اگر مغربی پاکستان فی الواقعہ مشرقی پاکستان کو لوٹ کھسوٹ رہا ہے تو کیا حکومت کا یہ فرض نہیں کہ وہ اس لوٹ کھسوٹ کو بند کرے۔ اور اگر یہ الزام غلط ہے تو کیا حکومت پر یہ لازم نہیں کہ وہ اس الزام کی فوراً تردید کرے اور اس قسم کے غلط الزام لگانے والوں کو قرار واقعی سزا دے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری حکومت نہ یہ کرتی ہے نہ وہ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مشرقی پاکستان سے اس قسم کی آوازیں مسلسل اور متواتر اٹھتی رہتی ہیں۔ جن سے ملک کے دونوں بازوؤں میں کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔

ہم ملک کے ذمہ دار حضرات سے پرزور درخواست کریں گے کہ وہ اس صورت حالات سے اغماض برتتے ہوئے آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس کے تدارک کے لئے فوری اقدام کریں۔ اور سختی سے سخت قدم اٹھائیں۔ پاکستان کے استحکام کے مقابلہ میں کوئی اور کام زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔

جشن نامے

ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات

قیمت ۱۔ دو روپے آٹھ آنے۔

نقد و نظر

۱۔ قرآنی سبق یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوموں کا مستقبل ان کی آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس قسم کی آنیوالی نسل ہوگی اسی قسم کا اس قوم کا مستقبل ہوگا۔ اس لئے قوموں کی زندگی میں، ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا سوال اساسی اور بنیادی ہوتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان یہ ہے کہ ہماری فلاح و سعادت کا راز قرآنی تعلیم میں مضمر ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہمارے بچوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھالا جائے۔ بنا بریں ہر وہ قدم جو بچوں کو قرآن سے قریب لانے کے لئے اٹھایا جائے، ہمارے نزدیک قدر افزائی کا مستحق ہے۔ اس لحاظ سے ہم دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں جنہوں نے "قرآنی سبق" کے نام سے ایک ایسا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس میں بچوں کے لئے آسان زبان میں قرآنی ہدایات کی تشریح کی جائے گی۔ اس کا پہلا حصہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

ظاہر ہے کہ بچوں کو قرآن سے قریب لانے کی کوشش جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک بھی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس سے کسی مقام پر بھی کوئی غلط تصور بچوں کے ذہن میں قائم کر دیا گیا تو اس کا نقصان ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بچے کا قرآن سے ناواقف رہ جانا اتنا مضر نہیں ہوتا جتنا قرآنی تعلیم کے سلسلہ میں کوئی غلط تصور نقصان رساں ہوتا ہے کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں کے اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات پڑھے ہوئے بچے گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے بچوں کی بہ نسبت زیادہ دہریے اور دین سے متنفر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس اہم مقصد کے لئے دارالاشاعت کی نگہ انتخاب محترم محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی پر پڑی جو اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں۔

جس احتیاط کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس کے پیش نظر ہم نے اس کتابچہ کا بدقت نظر مطالعہ کیا ہے اور جو مقامات ہماری نظر میں کھٹکے ہیں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ انہیں سامنے لایا جائے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ قابل اصلاح مقامات کی شروع ہی سے اصلاح کر لی جائے تاکہ یہ سلسلۂ تعلیم مضر اثرات پیدا کرنے کا موجب نہ بنے۔

کتاب کے نام سے سمجھا جائے گا کہ اس میں قرآنی آیات یا الفاظ کی وضاحت ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کتاب معروف اخلاقی عنوانات پر مصنف کے اپنے خیالات کا مجموعہ ہے جنہیں بچوں کی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض عنوانات کے خاتمہ پر یا درمیان میں ایک آدھ قرآنی جملہ بطور فٹ نوٹ لکھ دیا گیا ہے۔ متعدد عنوانات میں ایسے فٹ نوٹ بھی درج نہیں ہوئے ہیں فٹ نوٹوں کا انتخاب بھی سرسری ہے۔ مثلاً "بہادری اور بزدلی" کا فٹ نوٹ ہے ان اللہ مع الصابرین "اللہ ثابت قدموں کے

کے ساتھ ہے"۔ ترجمہ کی جہت سے جملہ کا صحیح مقام "ثابت قدمی" پر سبق تھا جو شاملِ کتاب ہے۔ ہمارے خیال میں قرآنی تعلیم کا صحیح طریق یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کی سند اور تائید میں قرآنی آیت لکھی جائے۔

۲۔ کتاب کا محرک خیال یہ بتایا گیا ہے کہ بچوں کے لئے بنیادی اخلاق کی ایسی باتیں قرآن مجید سے منتخب کی جائیں جو ان کی سمجھ سے بالا نہ ہوں اور ان پر سلیس اور دلچسپ مضامین لکھ کر انھیں یوں بچوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ احکام قرآن کی خوبیوں کے قائل ہو کر کم عمری میں ہی ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں اور اپنی زندگی کو صحیح اسلامی اخلاق کے مطابق بنا سکیں۔ کیونکہ قرآنی تعلیم ہی اپنی معاشرتی اور قومی ترقی کے لئے سب سے ضروری اور نتیجہ خیز تدبیر نظر آتی ہے۔ چنانچہ پہلا سبق "قرآن سمجھ کر پڑھنا" یوں ختم ہوتا ہے

"پس اگر تم خدا کی ناراضی سے بچنا چاہتے ہو تو تمہارا کام یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کو خوب اچھی طرح سمجھو"۔

لیکن کتاب میں بہت سی باتیں ایسی درج ہیں جو بچوں کی سمجھ سے بالا ہیں۔ مثلاً

"خدا ہماری اس بے علمی اور نادانی پر ضرور ہنستا ہوگا"۔

"اللہ میاں نے روح اور اخلاق کے بیماروں کے لئے نسخہ تجویز فرمایا ہے"۔

"اللہ میاں نے فرشتوں سے ایک بار کہا کہ میں دنیا میں آدم کو اپنی جگہ سردار بنانا چاہتا ہوں۔

"صرف ابلیس نے آدمؑ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا"۔

"نہ جھکنے والا شیطان ہوتا ہے"۔

"کیا آپ ثواب کمائیں گے"۔

"انسان کے لئے اس سے بڑی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ اللہ اسے پسند فرمائے اور اللہ اس کے ساتھ ہو۔

خط کشیدہ الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا یقیناً بچوں کے لئے مشکل ہوگا۔

(۳) بعض باتیں ایسی بھی لکھی گئی ہیں جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہیں۔ مثلاً

"انھیں کوئی گالی دے تو وہ اس کے جواب میں دعائیں دیتے ہیں۔ کوئی ان کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو وہ اس کے جواب میں اپنا دوسرا گال بھی طمانچہ کھانے کو پیش کر دیتے ہیں۔ یہ بڑے دل گردے کا کام ہے"۔

دوست کو جو بات ناگوار ہو وہ کبھی نہ کرو"۔

(۴) بعض باتیں قرآنی تصورات سے ٹکراتی ہیں۔ مثلاً

(۱) پس اس اولاد سے زیادہ بدبخت کون ہے جو اپنے ماں باپ کو ناراض کرے۔ ان کا کہنا نہ مانے۔ ان کی فرمانبرداری اور خدمت سے جی چرائے۔ اور ان کے احسانوں کو بھلا دے"۔

قرآن نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ ان کی "اطاعت" کا حکم کہیں نہیں دیا۔ یہ درست ہے کہ چھوٹے بچوں کو

بہرحال ماں باپ کی اطاعت کے تحت چلنا چاہیئے۔ لیکن بچے کے ذہن میں یہ بٹھا دینا کہ اسے تمام عمر ماں باپ کی اطاعت کرنی چاہیئے قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں۔

(ب) جو بات بھی اصلیت کے مطابق اور ٹھیک ہو وہ سچ ہوتی ہے اور جو کچھ اصلیت کے خلاف اور غلط ہو وہ جھوٹ ہوتا ہے۔

سچ (صدق) اور جھوٹ (کذب) کی یہ تعریف جامع اور مانع نہیں۔ قرآن میں منافقین کے متعلق ہے کہ وہ آکر رسول سے کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ جس بات کے کہنے میں کہنے والے کا دل اور زبان ہم آہنگ نہیں وہ بھی جھوٹ ہے۔ اگرچہ خود وہ بات اصلیت کے مطابق اور ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔

(ج) "سچ پوچھو تو کڑوی بات بھی اسی لئے بُری چیز ہے کہ اس میں زیادہ تر جھوٹ ہی ہوتا ہے"۔

یہ بات تشنۂ وضاحت ہے۔ کڑوی تو سچی بات ہی لگتی ہے۔ حضرات انبیاء کرام ہمیشہ سچی بات کہتے تھے جو نہ ماننے والوں کو کڑوی لگتی تھی۔

(د) غرض انسان آپس میں کسی سے چھوٹا ہوتا ہے تو کسی سے بڑا بھی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی سے بڑا ہے تو کسی سے چھوٹا بھی یہی ہے انسان کی آپس کی برابری"۔

انسانی مساوات کا یہ تصور صحیح نہیں۔ بالخصوص جب اس کی وضاحت میں یہ بھی کہہ دیا جائے کہ "اگر آج تم دس سال کے ہو تو بیس سال والا تم سے بڑا ہے۔ لیکن دس سال بعد تم بھی بیس سال کے ہو جاؤ گے"۔

(ہ) "اللہ نے آدم کو اپنی جگہ سردار بنانا چاہا"۔

یہ بھی قرآن کے مطابق نہیں۔ اللہ نے آدم کو اپنی جگہ سردار نہیں بنایا۔

(و) بچوں کی تعلیم کے معاملہ میں سب سے زیادہ خطرناک مقام وہ ہوتا ہے۔ جہاں ان کے ذہن میں خدا کے متعلق غلط تصور قائم ہو جائے مثلاً زیر نظر کتاب میں بچوں سے کہا گیا ہے کہ

"اگر تم خدا کی ناراضی سے بچنا چاہتے ہو تو..... تم قرآن کو اچھی طرح سمجھو"۔

اس سے ذہن میں یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ خدا بھی (انسانوں کی طرح) خوش ہوتا اور ناراض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور بڑے غلط نتائج کا موجب بنتا ہے۔ یا مثلاً

"خدا ہماری اس بے علمی اور نادانی پر ضرور ہنستا ہوگا"۔

اس سے بھی بچوں کے دل میں خدا کے متعلق ایک انسان کا تصور پیدا ہو جائے گا۔ یہ اور اس قسم کے اور مقامات بہت نازک ہیں ان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

کتاب کی طباعت اور کتابت بچوں کے لئے موزوں ہے۔ یہ بڑی تقطیع کی ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور قیمت فی نسخہ

دَور دوپہ ہے۔

۲۔ تاریخ اسلام علمی محفلوں میں، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (مرحوم) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یوں تو ان کی نگاہ مختلف علوم و فنون کو اپنے دامن میں لئے تھی۔ لیکن تاریخ میں انہیں خاص درک حاصل تھا چنانچہ انہوں نے تاریخ اسلام کے نام سے مسلمانوں کی ایک مفصل تاریخ لکھی تھی جو تقسیم ہند سے پہلے کئی بار شائع ہوئی تھی۔ اب وہ تاریخ کمیاب (بلکہ پاکستان میں شاید نایاب) تھی۔ نفیس اکیڈمی (کراچی) نے اس تاریخ کو تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اسکے پہلے دو حصے اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ پہلے حصہ کی ضخامت قریب چھ سو صفحات اور دوسرے حصہ کی قریب پونے سات سو صفحات ہے۔ کاغذ۔ طباعت۔ کتابت جلد عمدہ۔ قیمت ہر حصہ بارہ روپے۔ پہلا حصہ امام حسنؓ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے۔ اور دوسرا حصہ بغداد کی تباہی کے بعد متفرق سلطنتوں کے ماجریات پر۔ شروع میں فن تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ بھی شامل ہے۔ اس تاریخ میں حدیث کی کتابوں کے علاوہ مصنف مرحوم کے الفاظ میں تاریخ طبری۔ تاریخ الکامل ابن اثیر۔ تاریخ مسعودی۔ تاریخ ابوالفدار۔ تاریخ ابن خلدون۔ تاریخ الخلفا۔ سیوطی وغیرہ کا مابہ الاشتراک نکال کر درج کر دیا ہے اور اس ترکیب سے تاریخ کا بہترین خلاصہ درج کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ مصنف نے تنقیدی نقطۂ نگاہ سے تاریخ مرتب نہیں کی بلکہ مختلف کتب تاریخ کا مابہ الاشتراک جمع کیا ہے اس اعتبار سے یہ تاریخ ان لوگوں کے لئے مفید ہوگی جو مذکورہ صدر کتب تاریخ کا از خود مطالعہ نہ کر سکتے ہوں لیکن یہ جاننا چاہتے ہوں کہ ان کے مندرجات کیا ہیں۔

ہمارے ہاں سب سے پہلی (مفصل) تفسیر بھی طبری نے لکھی اور تاریخ بھی۔ اس کے بعد تفسیر یا تاریخ میں جو کچھ لکھا گیا وہ اسی کی اتباع میں لکھا گیا۔ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے جسے تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے، کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس لئے (بھی) کہ یہ کام بڑا مشکل بھی تھا اور نازک بھی۔ نازک اس لئے کہ ہماری تاریخ صرف مسلمانوں یا ان کی سلطنتوں کی تاریخ نہیں۔ اس میں وہ ہستیاں بھی آجاتی ہیں جن کے ساتھ (کسی نہ کسی رنگ میں) ہمارے اعتقادات وابستہ ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اعتقادات کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ دنیا کو ابھی اس مؤرخ کا انتظار ہے جو قرآن کو اپنا محور قرار دے کر اس کی روشنی میں ہمارے قرنِ اول کی تاریخ از سرِ نو مرتب کرے۔ وہی تاریخ ہمارے اس دور کی قابلِ اعتماد تاریخ قرار پا سکیگی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، مولانا اکبر شاہ خاں صاحب کی تاریخ، سابقہ کتب تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس لئے اس کا انداز بھی تقلیدی ہے۔ تنقیدی نہیں۔ یعنی جو واقعات ہماری کتب تاریخ میں درج چلے آرہے ہیں انھیں اسی طرح سے لے لیا گیا ہے۔ مثلاً واقعہ ہجرت کے ضمن میں لکھا ہے کہ جب سراقہ بن مالک بن جشم نے حضورؐ کا تعاقب کیا۔

تو اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو اس کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ (پھر آگے بڑھا تو) اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا (جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۳)

ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو رسول اللہ کا معجزہ قرار دیا جائے گا۔ لیکن قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ حضور کو قرآن کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔

غزوہ بدر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> جب لڑائی خوب زور سے جاری تھی تو آنحضرتؐ نے ایک مٹھی بھر خاک اٹھائی اور اس پر کچھ دم کر کے کفار کی طرف پھینک دی۔ اسی وقت کفار کے لشکر نے بھاگنا شروع کر دیا۔ (جلد ۱ صفحہ ۱۵۹)

قرآن میں حضورؐ کے تیر چلانے کا ذکر ہے۔ مٹھی بھر خاک پھینکنے کا نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ نے مٹی پر دم کر کے دشمنوں کو بھگانا ہوتا تو آپؐ اور آپؐ کے ساتھی دین کے قیام کے لئے اس قدر جانکاہ مشقتیں کیوں اٹھاتے؟

حصہ اول کی تاریخ میں مشکل ترین (اور نازک ترین) مقام وہ ہے جہاں ہم عین خلافتِ راشدہ کے زمانے میں صحابہ کرام کی باہمی مشاجرت ہی نہیں بلکہ جنگ و قتال دیکھتے ہیں (جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ) ان واقعات پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے۔

> اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر سوچیے گے تو یقیناً تسلیم کر لو گے کہ صحابہ کرام کی مشاجرت درحقیقت خدائے تعالےٰ کی طرف سے ایک سامان تھا حفاظتِ شریعت کا اور آنحضرتؐ کا یہ ارشاد کہ اختلاف امتی رحمۃ ایک باب تھا حق و حکمت کا۔ لیکن ہم نالائقوں نے رحمت کو اپنے لئے زحمت بنا لیا۔ (جلد ۲ صفحہ ۵۰)

آپ یقیناً متعجب ہوں گے کہ صحابہؓ کی مشاجرت، حفاظتِ شریعت کا ذریعہ کس طرح بن گئی؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

> مدینہ منورہ مہاجرین و انصار کا گہوارہ اور اس کے بعد خانہ کعبہ کی وجہ سے کہ معظمہ دوسرا مرکز اسلام تھا۔ جب تک صحابہ کرام کو تعلیم و تدریس کی فرصت میسر نہ تھی۔ مدینہ منورہ دارالخلافہ رہا۔ لیکن جب خدائے تعالےٰ نے صحابہ کرامؓ سے تعلیم اسلام کا کام لینا چاہا تو مدینہ منورہ سے مرکز خلافت ہٹا دیا اور وہ مدینہ جو کچھ دنوں پہلے جنگی طاقت کا مرکز اور فوجی کیمپ بنا ہوا تھا ایک دارالعلوم کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں کو تحقیق و تدقیق کی نگاہ سے دیکھو تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ حدیث و فقہ تفسیر کا تمام تر مواد صرف اسی زمانے کا رہین منت ہے جس زمانے میں صحابہ کرام کے درمیان مشاجرات برپا تھے۔
>
> اگر یہ مشاجرات برپا نہ ہوتے۔ اگر حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی معرکہ آرائیاں نہ ہوتیں تو ہم آج شریعتِ اسلام کے ایک بڑے اور ضروری حصے سے محروم و نابلد ہوتے۔ مگر یہ کیوں ہونے لگا تھا! خدائے تعالےٰ خود اس دین کا حافظ و نگہبان ہے۔ وہ خود اس کی حفاظت کے سامان پیدا

کرتاہے۔ چنانچہ اس نے وہ سامان۔ یعنی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں اختلاف پیدا کیا (جلد ۲ ص ۵۳-۵۲)

یہ توجیہہ ارباب نظر کے نزدیک جس قدر اطمینان بخش ہوسکتی ہے ظاہر ہے نیز اختلاف امتی رحمۃ جیسی روایت کو جو قرآن کے صریحاً خلاف ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد قرار دیدینا بہت زیادتی ہے۔

امیر معاویہؓ کے عہد میں قسطنطنیہ پر حملے کے ضمن میں لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا۔

پہلا لشکر میری امت کا جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگا۔ وہ مغفرت یافتہ ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ

امیر معاویہؓ نے ایک عظیم لشکر سفیان بن عوف کی سپہ سالاری میں قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا۔ سفیان بن عوف کی ماتحتی میں اپنے بیٹے یزید کو بھی جو صائفہ فوج کا افسر تھا۔ ایک حصۂ فوج کا سپہ سالار بنا کر روانہ کیا۔ (جلد ۲ ص ۳۴)

یہ وہی یزید ہے جس کے عہد میں واقعہ کربلا ہوا تھا اور جس کے متعلق مصنف مرحوم نے آگے چل کر لکھا ہے کہ

اس کو مذہب اور روحانیت سے بہت ہی کم تعلق تھا۔ اور اس میں فسق و فجور اور خلافِ احکامِ شرع اعمال بھی تھے۔ (جلد ۲ ص ۹۶)

معلوم نہیں ان دونوں میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟

ہم نے یہ چند باتیں مثالاً پیش کی ہیں۔ ورنہ ساری کتاب ہی روایتی تعلید میں لکھی گئی ہے۔ بہر حال اگر تنقید سے قطع نظر کرلی جائے تو اس تاریخ میں معلومات کا ذخیرہ بہت ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اردو خواں طبقہ کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

۳۔ اکنامک ڈائجسٹ (ECONOMIC DIGEST)

مغربی ممالک، بالخصوص انگلستان اور امریکہ سے ایسے مجلات بکثرت شائع ہوتے ہیں۔ جن سے قارئین تھوڑے سے وقت میں بہت سی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ معلومات بڑے قرینے سے ترتیب دی ہوتی ہیں اس لئے ان کا ششماہی یا سالانہ مجموعہ موضوع متعلقہ پر اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا بن جاتا ہے۔ ان مجلات کو دیکھ کر اکثر جی چاہتا تھا کہ اے کاش! ہمارے ہاں سے بھی اس قسم کے مجلات شائع ہوں۔ مقامِ مسرت ہے کہ زیر نظر ہفتہ وار (انگریزی) مجلے نے اقتصادیات کے شعبہ میں ہماری اس آرزو کو پورا کردیا۔ اس میں پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک (بالخصوص) مشرق وسطیٰ کے متعلق مفید اقتصادی معلومات۔ اخبارات کے اہم تبصرے۔ اہم کتابوں کا تعارف وغیرہ سلیقے اور قرینے سے ترتیب دیا ہوا ملے گا۔ قیمت فی پرچہ چھ آنے (طلباء، اساتذہ اور لائبریریوں سے چار آنے) پتہ۔ دی انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس۔ کراچی

(The Institute of Development Economics Karachi.

۴۔ فاروق العزیز

محترم عبیداللہ صاحب، ملتان کے ایک علمی گھرانے کے فرد ہیں۔ ان کا ایک نوجوان بیٹا ندامتی کالج کا طالب العلم تھا۔ فاروق العزیز نام۔ اس مخلص نوجوان کے دل میں اسلام کی خدمت کا بڑا جذبہ تھا جس کی تسکین کے لئے اس نے مولانا الیاس مرحوم کی تبلیغی جماعت سے اپنا سلسلہ وابستہ کر لیا۔ اور اس میں اس قدر جذب و انہماک سے کام کیا کہ اپنی صحت کی بھی پرواہ نہ کی۔ نتیجہ یہ کہ اس جماعت کے ہیڈ کوارٹر۔ یعنی بستی نظام الدین اولیاء (دہلی) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے دل درد آگیں پر اس سے جو صدمہ گذرنا تھا وہ ظاہر ہے۔ انھوں نے بیٹے کی یاد میں یہ کتاب لکھی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرات انبیاء کرام۔ صحابۂ عظام اور دیگر اسلاف امت نے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں کس قدر مصیبتیں برداشت کیں۔ اس سلسلہ میں (مصنف کے خاندان کے دیگر بزرگوں کے علاوہ) صاحبزادہ فاروق العزیز کی خدمات اور مصائب کا بھی ذکر ہے۔ جن حالات میں کتاب لکھی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس میں جذبات کی شدت ناگزیر تھی۔

طباعت۔ کتابت۔ جلد عمدہ۔ ضخامت قریب پونے پانچسو صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ مدرسۃ البنات۔ جناح چوک۔ کراچی ۳۔

۵۔ تحفۂ اثنا عشریہ (اردو)

شائع کردہ۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۶۲۴ صفحات۔ قیمت مجلد مع ڈسٹ کور بارہ روپے۔

منتظمین نور محمد کارخانہ تجارت کتب علمی حلقوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے جو اسلاف کے علمی کارناموں کے ان ذخائر پر جو بدقسمتی سے آج ناپید ہوتے جا رہے ہیں مشتمل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان کا یہ اقدام قابل مبارکباد ہے کہ وہ اس علمی سرمایہ کو اردو زبان میں منتقل کر کے پیش کر رہے ہیں جس سے (رجحانات موجودہ) ان کتابوں کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

طلوع اسلام کا مسلک ـــــ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے ـــ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ وہ کسی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس معنی میں نہ وہ سنی ہے نہ شیعہ۔ کیونکہ اس کے نزدیک فرقہ پرستی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ لہٰذا اس کتاب پر ہمارا تبصرہ اس حیثیت سے تو قطعاً نہیں ہو سکتا کہ یہ کتاب فلاں فرقہ کے پیرو کی لکھی ہوئی ہے اور فلاں فرقہ سے متعلق ہے۔ ہم محض کتاب کی علمی حیثیت اور اس کے معلوماتی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے کتاب پر تبصرہ کر رہے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ علمی دنیا میں کون ہوگا جو شاہ صاحب کے علمی پایہ کا انکار کر سکے۔ تحفۂ اثنا عشریہ انہی شاہ صاحب کی تصنیف ہے جو موصوف نے مذہب تشیع کے بارے میں تحریر فرمائی تھی۔ اصل کتاب فارسی زبان میں تھی اور اس لئے عام لوگ اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے اس ضخیم کتاب کا ترجمہ مولانا سعد حسن خاں صاحب یوسفی فاضل الٰہیات سے کرا کے شائع کیا ہے۔ یہی ترجمہ اس وقت زیر تبصرہ ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مدلل ہے۔ جابجا حضرات شیعہ کی مستند کتابوں کے حوالے ہیں۔ کوئی بات بغیر سند اور حوالہ کے نہیں کہی گئی۔ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شیعہ مذہب کی تاریخ اور وہ اسباب و عوامل بیان کئے گئے ہیں جو اس مذہب کی پیدائش پر اثر انداز ہوئے۔ اس کے بعد ان کے ۷۳ فرقوں کا حال لکھا گیا ہے اور ان کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں تشیع کی دعوت و تبلیغ کے اصول اور مراتب گنائے گئے ہیں۔ نیز ان حربوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو ناواقف لوگوں کو فریب دینے کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً سو سے اوپر ہے۔ تیسرے باب میں شیعوں کے اسلاف اور اکابر رجال کا حال لکھا گیا ہے جو سات طبقوں پر مشتمل ہیں۔ چوتھے باب میں شیعوں کی احادیث کی اقسام اور ان کی سندوں کے راویوں کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب میں شیعی الٰہیات کا تذکرہ ہے۔ اور ان کے بائیس عقائد کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں نبوت کا بیان ہے اور اس سلسلہ میں شیعوں کے مخصوص عقائد کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انبیاء کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ بلحاظ تقیہ واجب ہے۔ انبیاء کے لئے نبوت سے پہلے اور بعد واجبات ایمان کا جاننا ضروری نہیں۔ انبیاء سے ایسے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں جن کا انجام ہلاکت ہو۔ حضرت آدم ائمہ اہلبیت سے بغض و حسد رکھتے تھے۔ بعض انبیاء نے نبوت کی پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر دی تھی۔ حضرت علیؑ پر وحی آتی تھی۔ شرعی احکام کو ائمہ کی روایات منسوخ یا موقوف کر سکتی ہیں۔ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس شرعی حکم کو چاہے منسوخ یا تبدیل کر دے ساتویں باب میں مسئلہ امامت سے بحث کی گئی ہے جو مسلک تشیع کا بنیادی مسئلہ ہے۔ مثلاً امام کا ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ وہ غائب بھی رہ سکتا ہے اور اس کے باوجود امام رہتا ہے۔ امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ امام کے تقرر پر اللہ کی طرف سے نص صریح کا ہونا ضروری ہے۔ امام ہر بات میں اپنے ہمعصروں سے افضل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کے بعد حضرت علی امام بلافصل تھے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کی طرف سے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں امور معاد سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں حضرات شیعہ کے عقائد کی تردید کی گئی ہے۔ نویں باب میں ان احکام فقہ کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں شیعہ حضرات دوسرے فرقوں سے منفرد ہیں۔ دسویں باب میں ان مطاعن کو بیان کیا گیا ہے۔ جو حضرات شیعہ کی طرف سے حضرات خلفائے ثلثہ، دیگر اصحاب اور خصوصیت کے ساتھ امہات المؤمنین اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی شان میں کئے جاتے ہیں۔ ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ گیارھویں باب میں شیعہ حضرات کے اوہام، تعصبات، وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ بارھویں باب میں تولا اور تبرا سے بحث کی گئی ہے۔

غرضیکہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مدلل ہے۔ اس میں شیعہ مذہب کے متعلق اتنی معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ اسکے بعد پھر واقعۃً کسی دوسری کتاب کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہمیں ان دشواریوں کا پورا پورا احساس ہے جو ایک مترجم کو علمی اور فنی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں پیش آتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ اس بارے میں اگر زیادہ محنت اور توجہ سے کام لیا جاتا تو ترجمہ کا معیار اس سے کہیں بہتر اور شگفتہ ہو سکتا تھا

موجودہ ترجمے سے اصل کتاب کی افادی حیثیت بہت گر گئی ہے۔ اور ہمیں قطعاً امید نہیں ہے کہ عام لوگ اس سے کماحقہ فائدہ اٹھا سکیں گے اس قسم کی اہم کتاب کے ترجمہ کا انداز اس قسم کا تو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

> اب رہی عقل۔ تو اس سے تمسک (حجت لانا) یا تو امور شرعیہ میں ہوگا یا غیر شرعیہ میں۔ امور شرعیہ میں اس فرقے کے نزدیک عقل بالکل قابل حجت نہیں۔ کیونکہ اسی سبب سے تو وہ قیاس کے منکر ہیں اور اس کو حجت نہیں مانتے۔ اور غیر شرعیہ میں اس کا قابل حجت ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ وہم، عادت و طبیعت کے شبہات سے پاک ہو اور صورت و اشکال میں ترتیب کی خطا سے بری اور دور ہو اور ان سب باتوں کا علم بغیر امام کے ارشاد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر فرقۂ انسانی کا خاصہ ہے کہ اپنی عقل سے چند چیزوں کو ثابت کرتا ہے اور چند سے انکار کرتا ہے اور یوں فرقہائے انسانی میں اصولی و فروعی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اب ان میں نری عقل سے ترجیح کیسے ہو۔ ورنہ پھر وہی جھگڑا اور آراء کا ٹکراؤ ترجیح میں منتقل ہو جائے گا۔ اس لئے لامحالہ عقل سے بالاتر فیصلہ کن ترجیح دینے والی کوئی ہستی ہو جو ایک جانب کو ٹھیک اور دوسری کو غلط ٹھہرا سکے۔ اور اس قسم کی فیصلہ کن ہستی سوائے نبی یا امام کے کون ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ ثبوت نبوت و امامت جن پر عقل موقوف ہے ابھی معرض بحث میں ہے۔ اس لئے عقل سے تمسک بھی ممکن نہ رہا۔ (ص ۱۹۵)

حتیٰ کہ جہاں قطعاً کوئی فنی بحث بھی نہیں ہے بلکہ محض تاریخی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ وہاں بھی ترجمہ کا انداز اسی قسم کا ہے۔

> ان شیعہ میں سے علماء کی ایک جماعت بڑی کوشش وسعی سے اہل سنت کی ان کتب تفسیر و سیر میں جو علماء و طلباء میں قلیل الاستعمال ہیں یا بعض ان کتب احادیث میں جو چنداں شہرت نہیں رکھتیں اور نہ وہ زیادہ دستیاب ہوتی ہیں جھوٹی باتیں جن سے مذہب شیعہ کا ثبوت ہو اور مذہب سنی کا بطلان ملا دیتی ہے ...... ـــ ۔ اور اسی طرح کتب تفسیر و سیر میں کہیں کہیں اس قسم کی جھوٹی ملاوٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کید میں بھی اکثر بے خبر علمائے اہل سنت الجھ جاتے ہیں اور دماغی تشویش کا شکار ہوتے ہیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی شہر میں دو شخص مرتضیٰ خاں اور مرید خاں نامی ایسے تھے جو امرائے شیعہ میں سے تھے اور جن کا کام یہ تھا کہ کتب اہل سنت مثلاً صحاح ستہ و مشکوٰۃ یا بعض تفاسیر کو خوشخط لکھواتے اور ان میں اپنے مطلب کی حدیثیں کتب امامیہ سے نکال کر درج کر دیتے۔ پھر ان نسخوں کو جدولوں اور سونے کے پانی سے زیب دیکر اونے پونے قیمت پر وہ گزر پہنچتے۔ چنانچہ اصفہان میں آغا ابراہیم بن علی شاہ جو سلاطین صفویہ کے بڑے بادشاہوں میں سے کسی کا امیر تھا۔ اس کید کا یہی طریقہ عمل میں لاتا تھا۔ الخ (ص ۲۶)

اتنی بڑی ضخیم کتاب کی طباعت پر جو زر کثیر صرف ہوا ہوگا اسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ اس قسم کا ہو جس سے عام آدمی کے پلے ہی کچھ نہ پڑے۔ ہم کارخانۂ تجارت کتب کے منتظمین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ اس پہلو پر زیادہ توجہ دیں۔ تاکہ ان کی مساعی افادی اور مالی دونوں اعتبار سے وہ نتائج پیدا کر سکیں جو ان کا مقصود ہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ منتظمین کارخانۂ تجارت کتب کے سامنے اس قسم کا ایک وسیع پروگرام ہے اور وہ اس قسم کی دوسری نایاب اور ضخیم کتابوں کو شائع کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی کتاب ازالۃ الخفاء کی اشاعت بھی جلد ہی ان کے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب بھی ہمارے نزدیک تحفۂ اثنا عشریہ سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ لیکن انہیں اس کی احتیاط کرنی چاہئے کہ ان کتابوں کا ترجمہ بھی اسی انداز پر نہ ہو۔

کتابت۔ طباعت اور کاغذ بہتر ہے۔ اور بارہ روپے قیمت زیادہ نہیں ہے۔

۶۔ عقلِ سلیم | شائع کردہ پاک امریکن کمرشیل انکارپوریشن۔ الفنسٹن اسٹریٹ۔ کراچی۔ سائز درمیانہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ غیر مجلد مع کور۔ قیمت درج نہیں۔

مشہور امریکن مصنف۔ ایچ۔ اے اورر اسٹریٹ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی نے کیا ہے۔ کتاب علم نفسیات سے متعلق ہے۔ اور جن لوگوں کو بچوں کی تعلیم و تربیت سے سابقہ پڑتا ہو۔ ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو جسمانی طور پر بالغ بلکہ بوڑھے ہو جاتے ہیں، مگر ذہنی اعتبار سے ہمیشہ بچے کے بچے ہی رہتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اسکے وجوہ اور علل کیا ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیا۔ فاضل مصنف نے اس کتابچہ میں اسی مسئلہ سے بحث کی ہے۔ کتاب مختصر اور جامع ہے۔ البتہ بعض مقامات پر خالص علمی اور فنی بحث کرتے ہوئے مصنف کا قلم جب امریکن پروپیگنڈے کی طرف مڑ جاتا ہے تو وہ طبع سلیم پر بڑا ہی گراں گذرتا ہے۔ بہتر ہو کہ اس قسم کی کتابوں میں اس نوع کے پروپیگنڈے سے دور ہی رہا جائے اور انہیں خالصتہً علمی اور فنی حدود تک ہی محدود رکھا جائے۔

۷۔ سدباب ذریعہ | شائع کردہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔ اسکول سائز۔ ضخامت ۶۴ صفحات۔ غیر مجلد۔ قیمت دس آنے۔

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو علامہ ابن القیمؒ کی تصنیف ہے۔ اور مولانا عبداللہ العمادی نے ترجمہ کیا ہے۔ مصنف نے اس رسالہ میں اس چیز سے بحث کی ہے کہ جو چیزیں شرعاً جائز نہیں ہیں۔ ان تک لے جانے والے اسباب و ذرائع بھی جائز نہیں ہوں گے غرضیکہ جس درجہ کی کوئی چیز ہوگی اسی درجہ کے اس کے اسباب و ذرائع بھی ہوں گے۔ علامہ ابن القیمؒ اہل حدیث کے امام ہیں اور قدرۃً انہوں نے اس بحث میں احادیث سے کام لیا ہے۔ ترجمہ خاصا شگفتہ ہے۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ دیدہ زیب ہیں۔

۸۔ علم الحدیث

شائع کردہ۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔ دکن۔ اسکول سائز۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات غیر مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

مولانا عبداللہ العمادی کی تصنیف ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ یورپ آج تک علمی دنیا میں بایں ہمہ ادعائے تحقیق و تفتیش مسلسل سعی و کاوش سے تاریخی مواد کی صحت و سقم کو جانچنے کے لئے جن اصول تک پہنچ سکا ہے۔ ہمارے محدثین کے اصول اس سے کسی طرح فروتر نہیں بلکہ اس سے بدرجہا بہتر ہیں۔

کتاب منکرین حدیث کے رد میں لکھی گئی ہے۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں جو مولانا مرحوم کے مخاطب ہیں۔ اسے واضح نہیں کیا گیا لیکن حدیث کے متعلق خود مولانا مرحوم کا مسلک کیا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے مقدمہ سے لگ سکتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> تاریخوں میں ہم واقعات کو پڑھتے ہیں۔ اس زمانہ کے تمدن کا اندازہ کرتے ہیں۔ جزئیات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہر قسم کی روایتوں پر بغیر درایت کی مدد کے یقین کر لینا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اس خوف سے کہ کہیں یہ ساری باتیں خلاف واقعہ نہ ہوں۔ کیا یہ جائز ہو سکتا ہے کہ سرے سے تاریخ ہی سے انکار کر دیا جائے۔

یعنی ان کے نزدیک احادیث کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

> جب ہم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بابرکت زندگی کا یقین ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص زندہ بھی ہو۔ اور عمر بھر نہ کچھ کہے سنے اور نہ کوئی کام کرے۔ لارڈ مالے بسٹر گلیڈسٹون کی ایک لائف لکھتے ہیں۔ جس میں گلیڈسٹون کے واقعات و تعلیمات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوتا ہے۔ اور ہم کو اس کی صحت میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب اسی طرح کی ایک کتاب عروہ ابن زبیر سے منسوب دیکھتے ہیں جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات و ملفوظات مذکور ہیں تو اس میں ہم کو اس شبہ کی نہایت وسیع گنجائش نکل آتی ہے کہ خبروں میں تو جھوٹ سچ کا گمان ہوا ہی کرتا ہے۔ اور رشید یہ میں ہم پڑھ چکے ہیں اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال جہاں احتمال آیا استدلال باطل ہوا)

حدیث بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ہی کا نام ہے۔ اور اگرچہ ہم کو بہت صاف لفظوں میں اعتراف ہے کہ اسلام کی تکمیل پر ان اقوال و افعال کے وجود و عدم کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ہے۔ اس کے لئے قرآن اور صرف قرآن کافی ہے۔ لیکن کیا ایک عظیم الشان پیغمبر اور دنیا کے مشہور ترین مصلح کے واقعاتِ زندگی اور حکیمانہ تعلیمات پر ہماری نظر نہ ہونی چاہیئے؟ جواب اگر اثبات میں ہے تو ایک وسیع النظر مسلمان احادیث سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا

ہے۔ کیا یہ باتیں احادیث کا موضوع نہیں ہیں؟

یعنی ان کے نزدیک اسلام کی تکمیل پر احادیث کے علم و وجود کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے لئے قرآن اور صرف قرآن کافی ہے۔

معلوم نہیں کہ اہل حدیث حضرات مولانا مرحوم کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے؛ اور انھوں نے منکرین حدیث کے ابطال میں جو خدمت سرانجام دی ہے اس کی نسبت ان کا کیا فیصلہ ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ آپ (جہلا اور متعصب لوگوں کو چھوڑ کر) اچھے سے اچھے مؤیدین حدیث کو کھرچ کر دیکھیں تو ان کے معتقدات کچھ اسی قسم کے نکلیں گے۔ جن کی بنا پر طلوع اسلام کو گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔

۹۔ گوتم بدھ نے جاتے ہوئے کیا کہا؟

شائع کردہ۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن۔ اسکول سائز ضخامت ۱۶ صفحات قیمت دو آنے۔

محمد اعظم صاحب عثمانیہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں موصوف نے گوتم بدھ کی ان وصایا کو جمع کیا ہے۔ جن کا تعلق خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلعم کی تشریف آوری سے متعلق پیشگوئی ہے۔

ملائم جلد اور دلکش نکھار کیلئے

نرم اور بھینی بھینی خوشبو والے جھاگ جلد کی صفائی کے ساتھ ساتھ آپ کے حسن کو حیرت انگیز طور پر نکھارتے ہیں

ذوالفقار انڈسٹریز
کراچی

کھیتی باڑی کے جدید طریقوں، گھریلو صنعتوں کی روز افزوں ترقی اور اسکولوں نیز شفاخانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے گاؤں کے باشندوں میں [illegible] اور خود اعتمادی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ پیٹرولیم [illegible] کی حتی المقدور باکفایت تقسیم کاری کے ذریعہ برماشیل بھی پاکستان کی نشوونما اور ترقی میں برابر کی شریک ہے۔

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

معراجِ انسانیت
حضور صلعم کی ذاتِ اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس مقام بلند پر فائز تھی۔ اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت ۱۰۰ بیس روپے۔

ابلیس و آدم
سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات۔ ملائکہ۔ وحی۔ شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کیلئے سلسلہ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ مجلد قیمت آٹھ روپے

جوئے نور
کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۲×۲۹ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟
زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا! بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۲×۲۹ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط
مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ
ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب ۴۱۶ صفحات۔ مجلد قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت
نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا سوچا اور قرآن اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

اسبابِ زوالِ امت
(دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں۔)

ملنے کا پتہ:- **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام** ۱۵۹/۲۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۲۹

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES TEETH PEARLY WHITE

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے — ہم پھر جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مگر کیا یہ جشن بھی اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم نو سال سے جشن مناتے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم نشاں اور درد انگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے بڑی دلچسپ کتاب ہے۔

مزاج شناس رسولؐ — پیشوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھئے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت۔ چار روپے

مقامِ حدیث۔ (ہر دو جلد مکمل) — حدیث سے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرِ حدیث کون ہیں غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملیں گی۔ ہر جلد تقریباً چار سو صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے۔

اسلامی معاشرت از پرویز — مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص۔ بچوں۔ عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کے لئے اس سے بہتر کتاب کو نہیں مل سکیگی۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

قرآنی فیصلے — روزمرہ زندگی کے اہم مسائل میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

قرآنی دستور پاکستان — اسمیں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت۔ علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے! اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات کا مجموعہ۔ جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

اقبال در قرآن از پرویز — علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:۔ **ناظمِ ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۲۔ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹**

آپ نے کبھی سوچا؟

شگفتگی۔ طراوت اور تبسم کے پیچھے کیا کارفرما ہے!
گرم دوڑتا ہوا لہو۔ اگر وہ ذرا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اس کی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی شدید کمی۔ اس خطرے کے تدارک کیلئے آپ کو مرغن غذاؤں کی نہیں بلکہ ....

وِم وائٹ (۳۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وِم وائٹ خریدیئے۔
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوافروش سے ملتا ہے۔

آپ رشک کرتے ہیں!

کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں یا پھر اپنی صحت کے اسباب ڈھونڈ نہیں پاتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی کلی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین صحیح طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپکے پاس نہیں۔

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)

ایک گرانقدر طبی تحفہ، ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسکے استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
[illegible] آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوافروش سے ملتا ہے۔

اپنے بچے کو آپ تندرست، توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ صحت افزا اور مقوی اشیا کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے ورثتاً ناقص خون پاتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ ان صورتوں کے علاوہ بھی انکی صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔

بچہ کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے

وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے

وِم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔
آپکے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوافروش سے ملتا ہے۔

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے
MISWAK